بہ سید ابو تراب خطائی ضامن
سالنامہ
الماس
مہارانی کالج میسور
غالب نمبر
چیف ایڈیٹر: قیوم صادق
IQBAL FAREED
مرزا اسد اللہ خاں غالب
۷۹۸ء ــــــــ ۱۸۶۹ء

سالنامہ

غالب نمبر ۱۹۶۹ء

الماس

سرپرست :-

شریمتی پاروتی پربھو۔ ایم۔ اے

پرنسپل مہارانی ویمنس کالج میسور

نگراں :-

سید ابو تراب خطائی ضامن ایم۔ اے

صدر شعبۂ اردو ۔ فارسی

چیف ایڈیٹر

قیوم صادق ایم۔ اے

شعبۂ اردو ۔ فارسی

خازن

ایم۔ پی۔ عبدالرشید

ایم۔ ایس سی

شعبۂ کیمسٹری

مدیرات

شاہین زہرہ بی ایس سی (سال آخر)

ثریا جان نشاط بی۔ اے (سالِ دوم)

نائب مدیرات

سیدہ ام حبیبہ بی۔ ایس سی (سال آخر)

سیدہ امتہ البصیر بی ایس سی (سال دوم)

بزم اردو ادب گورنمنٹ مہارانی ویمنس کالج میسور

مطبوعہ اسد پریس میسور

غالب نما

اداریہ

بزمِ ادب اردو مہارانی وینس کالج میسور کا سالنامہ "المَاس" کا یہ شمارہ اردو کے عظیم شاعر **غالب** کو مہارانی کالج کی طالبات کا ہَدِیَۂ عَقِیدَت ہے

غالب ہمارا محبوب موضوع ہے۔ اس پر تنقیدی اور تحقیقی دونوں انداز سے بہت کام ہو چکا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ہماری دلچسپی اس موضوع کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ نئے نئے گوشے بھی سامنے آتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی غالب کے بارے میں بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اس معنی میں اردو کی سب سے زیادہ خوش نصیب شخصیت ہے کہ اس سے متعلق جتنی بھی تفصیلی معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کسی بھی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں۔ اس کے معاصرین میں سے ذوق اور مومن ہی کو لیجیے۔ ہم ان دونوں کے بارے میں مقابلتہً کتنا کم جانتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ غالب کے معاصرین ہی سے کسی کی بھی عکسی تصویر نہیں ملتی بہرحال غالب ایک استثنا ہے۔

یہ غالب صدی ہے اس مہینے میں مرزا غالب کی وفات کو سو برس ہو رہے ہیں۔ ان کے نام پر تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ اُن کا کلام اردو اور دیگر زبانوں میں مختلف انداز و اہتمام کے ساتھ خاص و عام تک پہنچایا جا رہا ہے۔ رسائل اپنے خصوصی شمارے پیش کر رہے ہیں۔ ان کے فن اور ان کی شخصیت سے متعلق کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ سب کام ہو رہے ہیں اور بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ہم نے بھی غالب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے اس کا فیصلہ ہم قارئینِ کرام کی رائے سے لگا سکتے ہیں۔

ہم دل کی گہرائیوں سے ان تمام اساتذہ کے ممنون ہیں جنہوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور **غالب نمبر** کی تیاری میں ہمیں ہر ہر قدم پر مناسب مشورے دیئے ——— آخر میں ہم ان سب خواتین و حضرات کے ممنون و مشکور ہیں جنہوں نے اپنے گراں قدر مضامین ہمارے رسالے میں دے کر ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ اور ان سب خواتین و حضرات کے بھی جنہوں نے اپنے عطیہ جات اور اشتہارات دے کر ہمارے حوصلوں کو بلند کیا۔

معتقدانِ غالب

شاہین زہرہ و ثریا جان نشاط

مدیرات سالنامۂ الماس (غالب نمبر) مہارانی کالج میسور

رپورٹ :-

بزم کی ابتدائی کارروائی عہدہ داروں اور جماعتوں کے نمائندوں کا انتخاب تھا۔ استاذی جناب سید ابوتراب خطائی وجناب قیوم صادق کی نگرانی میں امیدوار حسبِ ذیل عہدوں پر منتخب ہوئے۔

نائب صدر۔ شمیم خانم بی ایس سی (سالِ آخر) معتمد۔ امتہ الحلیم بی اے (سالِ آخر) معتمد۔ رفیعہ مہکری بی۔ اے (سالِ دوم)

نمائندے :-

نسیم النساء اور فرخندہ عصمت	بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی	(سالِ آخر)
ثریا جان اور شمس النساء	" "	(سال دوم)
زاہدہ بیگم اور رفیع النساء	" "	(سالِ اول)
مبشرہ خانم اور منندرہ بانو	پی۔ یو سی	(آرٹس اینڈ سائنس)

سالِ رواں میں بزم کی کارروائیوں کا آغاز افتتاحی جلسے سے ہونے کی بجائے وداعی جلسے سے ہوا۔ استادِ محترم سید مبارز الدین رفعت پرنسپل و صدر شعبہ اردو و فارسی کے بنگلور تبدیل ہو جانے سے مورخہ ۱۶ر جولائی کے وداعی جلسے سے ہوا۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۶۹ء کو بزم کی کارروائیوں کا افتتاح جناب میر قدرت علی صاحب سشن جج بنگلور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صاحبِ موصوف نے بزم کے اراکین کے حوصلوں کو سراہا اور مفید مشورے دیئے۔ سید ابوتراب خطائی صاحب صدر بزم اردو ادب نے صدارت فرمائی۔

۲ر جنوری ۱۹۶۹ء کو محفل میلادالنبیؐ منعقد کی گئی۔ جلسے کی صدارت جناب محمد قاسم قریشی سٹی مجسٹریٹ میسور نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب محمد حنیف حکیم ریڈر و صدر شعبۂ اردو مہاراجہ کالج نے بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ آخر میں صدر جلسہ نے میلادالنبیؐ کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۹ر جنوری کی شام کو پروفیسر شہاب جعفری دلی یونیورسٹی نے جدید شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اپنی کتاب "سورج کا شہر" سے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ پروفیسر محمد ہاشم علی شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت فرمائی اور جدید شاعری کی عظمت کو واضح کیا۔ شامِ غزل کا حسین اور رنگا رنگ پروگرام ۲۵ر جنوری کی شام میں منعقد کیا گیا اور ریاستِ میسور کی مشہور شاعرہ محترمہ حسنی سرور صاحبہ نے صدارت فرمائی۔ کالج کی طالبات اور لکچرر صاحبان نے منتخب کلام سنایا۔ آخر میں حسنی صاحبہ نے اپنی کتاب "خواب زار" سے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ ۴ر فروری کو شام لطیفہ گوئی کا پروگرام پروفیسر علی محمد اسمٰعیل صدر شعبۂ عربی کی صدارت میں رکھا گیا۔ اساتذہ اور طالبات نے بڑے ہی پُرلطف لطیفے سنائے۔

ہماری بزم کی طالبات نے کالج یونین اور بزم کے تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی نمایاں حصہ لیا اور کئی انعامات حاصل کئے۔ شاہین زہرہ متعلم بی ایس سی (سالِ آخر) کو اردو میں یونیورسٹی میں فرسٹ آنے پر اسپیشل پرائز دیا گیا۔ بزم کی جانب سے تعلیمی سفر کے سلسلے میں اساتذہ کی نگرانی میں اوٹی گئے تھے۔ یہ پروگرام تفریحی اور تعلیمی پہلوؤں سے بے حد کامیاب رہا۔ جلسے کا اختتامیہ خطبہ مہمانِ خصوصی پروفیسر سید نذیر احمد پرنسپل یوتھ کالج میسور یونیورسٹی نے دیا۔ آپ نے بزم کی کارروائیوں کو سراہا اور ہمت افزائی کی۔ علم کی اہمیت پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ جناب سید ابوتراب خطائی صاحب صدر بزم اردو ادب نے صدارت فرمائی۔ جلسے کے بعد مختلف پروگرام مثلاً ٹیبلو اشتہارات کی نقل قوالی اور ڈرامہ پیش کئے گئے۔ ڈرامہ "غالب کی واپسی" شہر میسور کے مشہور ادیب جناب سلیم تمنائی نے لکھا اور جناب عبدالرشید لکچرر شعبۂ کیمسٹری نے اسٹیج پر حسن و خوبی پیش کیا۔ پروگرام کامیاب بنانے میں محترمہ انیسہ بیگم رشید کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ ہم تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے ادب کی بہت بڑی خدمت بجا لائی ہے لیکن ہم نے زبان کو صرف کلاس روم، نصاب کی کتابوں اور امتحانات ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہم نے ہمارے محدود وسائل اور پابندیوں کے باوجود زبان کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے اور ہماری زبان کی خدمت کے جذبے میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ آخر میں ہماری یہ ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم نے اُن حضرات کا جنہوں نے بزم ادب اردو کے علمی و ادبی اور تقریری مقابلے منعقد کرنے کے لئے اپنے قیمتی مشوروں کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی وقت بوقت مدد فرمائی ذکر نہ کریں۔ بالخصوص جناب علی محمد اسمٰعیل صاحب صدر شعبہ عربی جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہماری رہنمائی فرمائی۔

نائب صدر
شمیم خانم

معتمد
امتہ الحلیم

معتمد
رفیعہ مہکری

EDITORIAL BOARD

Sitting L to R : 1) Sri S. M. A. Qaiyum Sadiq M.A. Chief Editor 2) Sri S. A. Khatai M. A. President 3) Smt. K. Parvati Prabhu, M.A. Principal 4) Shamim Khanum III B. Sc. Vice President 5) M. P. A. Rasheed, M. sc. Treasurer.

Standing : L to R 1) Syda Amtul Baseer II BSc. Jt Editor 2) Shahin Zahara III B. Sc. Editor 3) Suraiya Jan II B. A. Editor 4) Syda Umme Habeeba III B. Sc. Jt Editor

Managing Committee

BAZM-E-ADAB URDU

MAHARANI'S COLLEGE MYSORE.

Sitting: L to R 1) Subbamma, III B.Sc. President College Association. 2) Amtul Haleem III B.A. Secretary 3) Shameem Khanum III B.Sc., Vice President 4) Mr. Mir Qudrat Ali, Session Judge B.A. LL. B. H.c.s. Chiefguest, 5) Mr. S.A. Khatai M.A. President 6) Mr. Ali Mohamed Ismail, M. A. 7) Mr. S M. A. Qaiyum Sadiq, M. A. Convenor.

Standing: L to R 1) Farkhunda Asmath, III B. Sc., 2) Zahidabegum I B.A. 3) Shamsunisa II B. Sc., 4) Rafiunisa I B. Sc., 5) Mubashira Khanum P. U. C. 6) Rafia Mehkari II B. A. Secretary 7) Munazirabano, P. U. C.

ماجدہ شیریں
بی اے (سال اول)

غالب کی کہانی

غالب کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ اگرچہ وہ مشہور اسد اللہ خاں کے نام سے ہوئے۔ سن ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ م ۳۱ دسمبر ۱۷۹۷ء کو سرزمین اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا عرف مرزا دولھا تھا۔ انہیں مرزا نوشہ کہا گیا۔ باپ مرزا عبد اللہ بیگ خاں اور چچا نصر اللہ بیگ خاں تھے۔ غالب کے دادا قوقان بیگ خاں اپنے والد ترسم خاں سے ناراض ہو کر سمرقند سے وارد ہوئے۔ ہندستان میں پہلے لاہور آئے اور نواب معین الملک کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے انتقال کے بعد سرکار میں نجف خاں کے توسل سے پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پھاسواں کی ذات اور رسالہ کی تنخواہ کی بطور جاگیر ملا۔ غالب کے دادا کے انتقال کے وقت سلطنت مغلیہ طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ جاگیر جاتی رہی تو غالب کے والد لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کے ملازم ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کے ہاں تین سو سواروں کی جمعیت ملازمت کی۔ ایک مدت کے بعد وہ ملازمت خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ حیدرآباد سے الور پہنچے اور راجہ راؤ بختاور سنگھ کی نوکری کی۔ وہیں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ غالب نے والی الور کے قصیدے میں لکھا ہے ؎

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرورتیست

درخاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

غالب لکھتے ہیں: پانچ برس کا تھا میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ میرا چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ جو انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرگ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکریٹری صاحب بمرگ ناگاہ

مرگئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ اس کے بعد ولیعہد نے چار سو روپیہ سال، ولی عہد اس تقرر کے دو سال بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے برصلہ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگر جیتے رہے مگر سلطنت جاتی رہی اور وہ تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دہلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھکو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوئے ہیں ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا ؂

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتاں خود آرا کہ ہائے ہائے

بادشاہ دہلی نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا۔ اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھے تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی ؂

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اوروں کی غزل میرے نام پر پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل مجھے بھیجدیجئے۔ "اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں"۔ میں نے کہا" لاحول ولا قوۃ" اگر یہ میرا کلام ہے تو مجھ پر لعنت ہے۔ اسی طرح ایک صاحب نے میرے سامنے مطلع پڑھا ؂

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر اور بت اور خدا میری طرز گفتار نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گذرے ہیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ہے۔ اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس اسد تخلص رکھا ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔"

۱۸۵۷ء میں ہندستان والوں نے انگریزوں کے تسلط سے چھٹکارہ پانے کیلئے جد وجہد کی۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا۔ یہ جد وجہد ناکام رہی۔ اس کی ابتدا ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی فوج نے کی۔ یہ فوجی ۱۱ مئی کو دہلی پہنچے اور بادشاہ کو برسر اقتدار لانے کیلئے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں اور ان کے مددگاروں کا قتل عام شروع کر دیا۔ علاقہ پنجاب و بنگال کے علاوہ پورے ہندستان میں انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع ہو گئی۔

دہلی بہت بڑا مرکز تھا۔ غالب نے بظاہر کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔ غالب بچ گئے۔ لیکن ہمہ کاری پنشن بند ہو گئی۔

نواب یوسف علی خاں ناظم والئی رامپور غدر سے پہلے غالب کے شاگرد ہو گئے تھے کبھی کبھی کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ پنشن بند ہوئی توانہوں نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جو غالب کی وفات تک ملتا رہا۔ مئی ۱۸۶۱ء سے بند پنشن بھی جاری ہوگئی اور بقایا بھی مل گیا۔ دربار اور خلعت بھی بند ہوگیا تھا وہ بھی مارچ ۱۸۶۳ء میں بحال ہوگیا۔ اور دسمبر ۱۸۶۶ء میں ایک خاص خلعت عطا ہوا۔

سفر کلکتہ کے بعد غالب دو مرتبہ رام پور اور ایک مرتبہ میرٹھ گئے اور کسی سفر کا ذکر نہیں ملتا۔ غالب نے فارسی کے مشہور لغت برہان قاطع پر کچھ اعتراضات قاطع برہان کے نام سے چھپوائے تھے۔ اس کی مخالفت بڑے شدومد سے کی گئی، جوابی کتابوں میں غالب کو برا بھلا کہا گیا۔ مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ نے قاطع القاطع لکھی۔ جس میں غالب کو گالیاں دی گئی تھیں۔ مرزا غالب نے اس کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن اہل علم گواہوں نے بے انصافی سے کام لیا اور امین الدین کا ساتھ دیا۔ آخرکار باہمی تصفیہ کرایا گیا اور مقدمہ داخل دفتر ہوا۔

آخر عمر میں غالب مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے رہے۔ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا۔ خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ بہرہ پن ایسا تھا کہ کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ جو کوئی ملنے آتا لکھ کر باتیں کرتا۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا لیکن اس حالت میں بھی شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے اور احباب کے خطوط کے جوابات دیتے رہے۔ آخر کار ۱۵ ر فروری ۱۸۶۹ء دوشنبہ کو یہ ادب کی شمع فروزاں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گل ہوگئی مگر اپنی روشنی رہتی دنیا تک کے لئے چھوڑ گئی۔ "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات نکالی گئی۔

غالب کی ادبی کاوشوں کے نتیجے میں چند کتابیں وجود میں آئیں۔ فارسی نظم و نثر میں یہ کتابیں ہیں:۔
۱۔ کلیات نظم فارسی۔ ۲۔ سبد چین ۳۔ سبد باغ دو در ۴۔ دعائے صباح۔ نظم میں۔ ۵۔ مثنوی ابر گہر بار کلیات میں شامل ہے مگر الگ بھی شائع ہوئی۔ فارسی نثر میں ۱۔ پنج آہنگ ۲۔ مہر نیم روز ۳۔ دستنبو (یہ کلیات فارسی میں شامل ہیں) ۴۔ قاطع برہان بعد اضافہ درفش کاویانی ماتر غالب لکھی گئی تھیں۔ کچھ خطوط متفرقات و سبد باغ دو در میں بھی شامل ہیں۔ اردو نظم میں ایک دیوان جس کے مختلف نسخے ہیں۔ حمیدیہ نسخے میں متروک کلام شامل ہے۔ سب سے زیادہ جامع اب تک مولانا عرشی کا مرتبہ نسخہ ہے۔ اردو نثر میں عود ہندی، اردوئے معلیٰ، مکاتیب غالب، نادرات غالب، نکات رقعات غالب، نامہ غالب، تیغ تیز، لطائف غیبی، اردو تصنیفات ہیں۔ بچوں کی فارسی تدریس کیلئے خالق باری کی طرز پر قادر نامہ اسمائے فارسی لکھا۔

غالب کو ہمیشہ ایک شکایت رہی کہ ان کے کلام نظم و نثر کی قدر و منزلت جیسی ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی یہ حقیقت ہے کہ وہ فارسی میں نہایت بلند مرتبہ شاعر و ادیب تھے۔ ان کے کلام کا فارسی کے مشہور شاعروں اور انشاء پردازوں سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ نظم فارسی میں ان کے کلام میں تمام وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان سے پہلے کے شاعروں

کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی میں وہ فارسی کے دیگر شعراء سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ جدت و لطافت میں ان کا مدمقابل بحیثیت مجموعی شاید ہی کوئی ہو۔ قطعہ، مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی، ہر صنف سخن اپنے عروج کی منزل میں ان کے ہاں موجود ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو ناامیدی کے حضور سے نکال کر جینے دوری کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت ملتی ہے۔ فلسفہ حیات و کائنات اور تصوف کے رموز و نکات سے کلام معمور ہے۔ انسانی جذبات و واردات کو نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

مرزا کو شراب پینے کی عادت تھی۔ اگر کسی دن نہ ملتی تو پریشان ہو جاتے اور کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتے۔ کہتے ہیں :-

"دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاسٹلین اور دوسری اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اور یہ دونوں (غدر سے پہلے) بیس، چوبیس روپیہ درجن آتی تھیں لیکن اب پچاس، ساٹھ روپیہ درجن ہو گئی۔ یہ گڑ چھال کی شراب میں پیتا نہیں تھا۔ یہ مجھے نقصان کرتی تھی اور مجھے اس سے نفرت تھی۔ تنگ آگیا، گزارہ مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں، قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک چاشت کا گوشت آدھا۔ شراب کا گلاب موقوف، اب بیس یا بائیس روپلے مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے، کہا گیا۔ "جب تک وہ نہ پلائیں گے" پوچھا "نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے"۔ جواب دیا کہ "جس طرح وہ جلائیں گے"۔

بارہ مہینے پورے نہ گذرے تھے کہ رام پور سے علاوہ مقرری کے اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا متفرق رہا خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔

باقی حال بھی غالب کی زبانی سنیئے، کہتے ہیں :-

"پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو اشتہار عام ہو گیا کہ اب قلمرو ہند میں عمل ملکہ معظمہ عالی مقام کا ہو گیا ہے۔ میں پہلے ہی سے مداحوں میں اپنا نام لکھا چکا تھا۔ اور ملکہ، دارا دربان کے وزرا کے دو سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا تھا۔ پہلی نومبر کو حسب الحکم کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ فقیر نے بھی اس تہیدستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن نہیں پایا تھا اپنے مکان پر روشنی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ نے فرزند ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم مقرر کیا"۔

"کبھی کسی کے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں درازی میں انگشت نما تھا کسی کے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ وراس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جب کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ اب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی داڑھی بھی۔ اس بھونڈ سے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچابند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جلاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال

میں نے جس دن داڑھی رکھی سر منڈوا دیا۔

میں اب انتہائے عمرِ ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لبِ بام ہوں۔ ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا۔

ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسطِ عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں لیکن تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر۔

ستر اہتر اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے بس میں بھی انحراف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے صبح کا قند اور شیرۂ بادام تحشر، دوپہر کو گوشت کا پانی سرِ شام تلے ہوئے چار کباب، سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں پوچ ہوں عاصی ہوں روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسبِ حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

"اسد الاخبار" اور "اشرف الاخبار" والے کہ یہیں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں سوانح کے اخبار میں اپنا مفصل حال چھپوا دیا۔ اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک خطوط کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

پہلے مقدار غذائی تولوں پر منحصر تھی اب ماشوں پر ہے۔ ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا ہوں حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں، روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل کوئی اختلاط کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت جسم سے نفرت روح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقعہ ہے

ع حزم آں روز کزیں منزلِ ویراں بگذرم

آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ آنکھوں میں ضعفِ بصر ناتوانی زور پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف و سستی گرانی و ہجرانِ جان، رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ پر ہے۔ اپنا مصرع چپکے چپکے دہراتا ہوں ع اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔

اب مرگِ ناگہاں کہاں رہی۔ اسباب و آثار جمع ہیں۔ ہائے الٰہی بخش معروف کا کیا مصرع ہے

ع آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں۔

سابق الامین۔ جبار ان کالج ۔
جناب ضمیر عاقل شاہی "بیری"

زبانِ اردو

آج مقصود بیاں اپنا ہے شانِ اردو — یہ زباں مجھ کو عطا ہے کہ جہانِ اردو
لو اگلتی ہے جواہر میری کانِ اردو — کیوں مرصع نہ بنے مجھ سے بیانِ اردو
جبکہ میسور نہیں ہیچمدانِ اردو

عربی، فارسی کے اس میں جواہر پارے — کہیں ترکی کہیں انگلش کے چمکتے تارے
اسی رادھا یہ ہیں سنسکرت کے موہن والے — ایک مسلک میں ہیں دھرم اور مذاہب سارے
کُل زبانوں کا نمکدان ہے خوانِ اردو

سب کے جذبات کو اس سانچے میں ڈھلتے دیکھا — اس کے ہاتھوں میں سیاست کو مچلتے دیکھا
نیچ اور اونچ کی تفریق کو ٹلتے دیکھا — شانِ گاندھی کو اسی گود میں پلتے دیکھا
آتما ہند کی ہے اصل میں جانِ اردو

وہ لطافت ہے کہ غیروں میں اثر کرتی ہے — مشترک بن کے مساوات کا دم بھرتی ہے
غیر کو اپنا بنانے کیلئے مرتی ہے — غیر مانوس ممالک میں بھی گھر کرتی ہے
ایک بھارت ہی نہیں آج مکانِ اردو

ہندو مسلم کی اخوت کا ہے ورثہ باقی — شکر ہے اپنے بزرگوں کا ہے صدقہ باقی
عزم و ہمت ہے تو پھر کس کا ہے خدشہ باقی — یوں اگر دل میں ہے تبلیغ کا جذبہ باقی
کل نظر آئینگے پیرس میں بتانِ اردو

اضطرابِ اہلِ حوادث کے لئے وجہ قرار — تھیس احباب کی اس کو لگی کرنے بیدار
شاخ کے کٹنے میں پوشیدہ ہے پیغامِ بہار — اختلافات کسی امر میں۔ ہیں عین سدھار
ہندی پرچار ہے تعمیرِ زبانِ اردو

گو سخنور کی شریعت کا غلو ہے دستور — کیا کہے اس سے فزوں تر یہ ضمیر مجبور
سنیئے اک ہادیِ اردو کی حدیثِ مشہور — "احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآں بھی اترتا بزبانِ اردو"

ے داغ دہلوی ۔ "دلی"

امتہ الحلیم، بی اے (سال سوم)
معتمد بزم اردو۔

عکسِ غالبؔ

دلّی میں مرزا غالبؔ کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں انہوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہا کئے یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اکتایا اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خان کے پھاٹک یا اسکے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جاکر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مطالعہ کتب:- جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لئے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لئے بھی باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گذری کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

قید ہونیکا واقعہ: مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا۔ مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی

تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اسکی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں۔ اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمتہ اللعالمین دلداروں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔"

بدیہہ گوئی: ۱۸۷۱ء میں جب کہ نواب ضیاالدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے ہیں مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ شعراء کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے"۔ اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا فیضی جب پہلی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت اتجالاً کہکر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ ڈوچار نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر تھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔ جو کہ ان کے دیوان ریختہ میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

فراخ حوصلگی: مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:-

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غالب کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی۔ اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام

لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے انہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کیلئے بھیج دی تھیں۔ جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب انکو چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا یا اور انعام دے کر رخصت کیا۔

حافظہ: جیسی مرزا کی طبیعت میں ذکاوت اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ہمیشہ کرایہ کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی ان لوگوں کے ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علیحدہ بھیجی تھیں چنانچہ انہوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثرات کو سرخوشی کے عالم میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

خودداری: مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا۔ مگر خودداری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء اور عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے۔ اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنہ دینا تھا اس لئے اول وہاں گیا تھا وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

خوراک: مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھچڑی یا شولا کبھی نہیں کھایا۔ اخیر عمر میں انکی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر میں سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین بھیجہ بھر دہی۔ اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ انکی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

نا ؤ نوش: مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو تعداد انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اسکی کنجی داروغہ کے پاس

رہتی تھی، اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہر گز میرا کہنا نہ ماننا، اور کنجی مجھکو نہ دینا، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو برا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہر گز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقداریں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اسمیں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را

مگر با وجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرنشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے ان کی تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

دادِ سخن: ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اس کے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا ہو خواہ برا برابر تحسین و آفرین کی جاتی ہے اور اچھے اور برے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی مغرور و محترم آدمی ہو جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہر گز اسکی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو ان کا ثقل سماعت انتہا کو پہونچ گیا تھا مگر پہلے ایسا نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سن لیتے تھے۔ مگر جب کوئی شعر ان کے دل میں نہ چبھتا تھا تس سے مس نہ ہوتے تھے۔ ان کے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے۔ اور اسی لئے ان کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے مگر مرزا باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا طریقہ جو انہوں نے اختیار کیا تھا اس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغہ کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کیلئے ایسا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ذوق سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔

انصاف: شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی۔ ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خاں مرحوم کہتے ہیں کہ مرزا کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا بھیا تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا" اس شعر کو بھی انہوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے ؎

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف میں شاید ان کا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انہوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اس کی بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا "کہ اگر میں اب رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"۔

ناقدر دانی کی شکایت: وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے چنانچہ اس بات کی انہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں جابجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفٰے خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا، جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔[۲۴]

خانگی تعلقات: مرزا کی بی بی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں وہ نہایت متقی پرہیز گار اور نماز روزہ کی سخت پابند تھیں۔ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ بااین ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر ان کے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور ان کے تمام رشتہ داروں کیساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھکر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنھیں ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

جنازے کی نماز: مولانا حالی لکھتے ہیں:-
آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔ اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار دفن کئے گئے۔ مرزا کے جنازے پر جب کہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی راقم بھی موجود تھا۔ اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفٰے خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہلِ سنت اور امامیہ دونو فرقوں کے

لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان بنیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا گیا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے، ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کئے گئے، اسمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنّی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جسطرح زندگی میں ان کا برتاؤ سنّی اور شیعہ دونوں کیساتھ یکساں رہا تھا اسیطرح مرنے کے بعد بھی دونو فرقے ان کی حق گذاری میں شریک ہوتے۔

شوخی: ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا، کبھی حقّہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا بھی کھا لیا، یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے، اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

میر مہدی حسین مجروح کو خط میں لکھتے ہیں ؎

میں بھولا نہیں تجھ کو، اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت خاں کی نہر ہے، میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا، سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں، صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنیاں ہو گئی ہیں، مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے کتابیں قلمدان، سب توشہ خانے میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کہاں بیٹھکر؟ پانچ چار دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی، کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔ ۔ ۔ ۔

وسعتِ اخلاق: مرزا کے اخلاق و عادات وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اسی لئے ان کے دوست ہر ملّت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔

ۓ مرزا صاحب ان کی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں۔

ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائش سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض مخلص و مخلص دوست کرتے تھے اور ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافہ میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انہوں نے میسور کے ایک شہزادہ کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے۔ اس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں "حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت؟ ہنجار نوازش نیاز منداں بے نوا نہ اینست۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ محرومم نہ سوداگر۔ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش۔ پذیرندہ مطایم نہ گیرندہ بہا۔ ہر چہ آزادگان بشہزادگاں فرستند ندرست و ہر چہ شاہزادگاں بخشند تبرک ہیچ و شمار نیست۔ چوں چنیں نیست ہر چہ فرستادہ ام ارمغان ست و ہر چہ خواہم فرستاد ارمغان خواہد بود۔"

کتاب فہمی:

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں فرماتے تھے کہ:۔

"میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ ؒ بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔"

(ماخذ: "یادگارِ غالب" مرتبہ مولانا الطاف حسین حالی)

خمریاتِ شوخیِ غالب

مرتبہ انوری بیگم بی اے بی ٹی۔

• جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

• رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

• میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

• مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

• رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے

• پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

محترمہ حسنیٰ سرور

نذرِ غالب

اے کہ تو باغبانِ اردو ہے
اے کہ تو پاسبانِ اردو ہے
اے کہ تو آسمانِ اردو ہے
اے کہ تو گلستانِ اردو ہے
ایک شاعر بھی، فلسفی بھی تو
رند بھی تو ہی اور ولی بھی تو
صاف گو اور صاف باطن تھا
زندہ دل، پُرخلوص مومن تھا
تو نے زلفِ غزل سنواری ہے
اک نئی جان تو نے ڈالی ہے
اک نئی راہ تو نے دکھلائی
شاعری نے شگفتگی پائی
بذلہ سنجی و نکتہ سنجی کے
شعریت میں کھلائے گل بوٹے
جلوۂ حسن کی کہیں کرنیں
اور غمِ عشق کی کہیں ٹیسیں
فلسفہ کی کہیں یہ گہرائی
کہیں روحانیت کی گہرائی

جیسے قوس و قزح کے رنگوں سے
تو نے آرائشِ سخن کی ہے
ایک عالم کا تو رہا نبّاض
اور انسانیت کا درد شناس
چارہ گر اور عیسیٰ دوراں
تیرے اُردو پہ ہیں کئی احساں
اے کہ تو تاجدارِ ملکِ غزل
تجھ سے قائم وقارِ صنفِ غزل
اہلِ اُردو کی جان غالب ہے
بزمِ اُردو کی شان غالب ہے
اے کہ تو ترجمانِ فطرت ہے
جاوداں دیکھ تیری عظمت ہے
تو نے راہوں میں جو کیے روشن
ہیں ابھی تک چراغ وہ روشن
آندھیوں میں بھی بجھ نہ پائیں گے
قافلے یونہی بڑھتے جائیں گے۔

شاہین زہرہ، بی ایس سی
(سالِ سوم) مُدیرہ۔

غالبؔ کی سیرت کے چند نمایاں پہلو

اردو میں پہلی بھرپور اور رنگین شخصیت غالبؔ کی ہے۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں سے اجاگر ہوتی ہے کہ ان کا احاطہ کسی ایک شخص کیلئے کسی ایک مضمون کے محدود دائرے میں کرنا مشکل ہے، تاہم ان کی سیرت کے چند نمایاں پہلو ذیل کے عنوانات کا سہارا لیکر بیان کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ وسعت اخلاق

۲۔ شوخی اور طنز و ظرافت

۳۔ جدت پسندی اور انفرادیت

۴۔ رندی

۵۔ مذہب اور غالبؔ

۱۔ وسعتِ اخلاق: غالبؔ نہایت ہی وسیع الاخلاق انسان تھے، ان سے جو بھی ملنے آتا اس سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ وہ دوستوں کی خوشی سے خوش اور غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندستان بھر میں بیشمار تھے جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی شیعہ بھی اور سنی بھی، زاہد بھی اور رند بھی۔ غالبؔ ان دوستوں سے جو گردشِ افلاک سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ غدر کا سانحہ ان کے لئے نہایت المناک تھا جس میں شرفاء ذلیل کر دیئے گئے اور زندگی کی قدریں بدل گئیں۔ ایک مرتبہ غالبؔ کے ایک دلی دوست جنکا شمار کبھی دہلی کے عمائدین میں ہوتا تھا اور جو گردشِ افلاک کا شکار ہو چکے تھے نہایت ہی سستے قسم کے کپڑے کا بنا ہوا لباس پہنے مرزا سے ملنے آئے۔ غالبؔ نے انہیں ہمیشہ عمدہ لباس پہنے ہوئے دیکھا تھا انہیں اس لباس میں دیکھکر بہت ہی رنجیدہ ہوئے پھر کہا کہ یہ بہت نفیس کپڑا ہے ہمارے لئے بھی منگوا دیجئے۔ وہ صاحب بولے کہ آپ کو پسند ہے تو یہی لے لیجئے۔ غالبؔ نے کہا دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر سردی شدت کی ہے یہ کہکر انہوں نے اپنا ایک نیا اور قیمتی لباس انہیں پہنا دیا۔ غالبؔ لاکھ رند مشرب سہی

[illegible]

جس سے تھا خودداریٔ ارباب حاجت کا نباہ
وہ سلیقہ تم سے اے اہل کرم جاتا رہا۔!

یہی وہ سلیقہ ہے جس سے خودداریٔ ارباب حاجت کا نباہ ہو سکتا ہے۔

غالب دوسرے شعراء کی طرح تنگدل نہ تھے۔ وہ دوسرے شعراء کے بہترین کلام کی تعریف ضرور کرتے تھے۔ ذوق سے اکثر چوٹیں چلتی رہتی تھیں مگر غالب نے کبھی ذوق کی ہجو کی وہ ذوق کی دل سے عزت کرتے تھے۔ انہیں ذوق کا یہ شعر بہت پسند تھا۔ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

اور مومن کے ایک شعر کی تعریف کی حد ہی کر دی۔ کہتے تھے کہ کاش مومن میرا سارا دیوان اس شعر کے بدلے لے لے اور یہ شعر مجھے دیدے۔ وہ شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

باوجودیکہ گردش زمانہ نے انہیں سخت مصیبتوں میں گرفتار کر دیا تھا وہ اپنی وضعداری اور خودداری میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ ان کی وضعداری اور خودداری کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جب کہ انہوں نے سرکاری ملازمت سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ سکریٹری جیمز ٹامسن ان کے استقبال کو نہ آیا۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے بزرگوں کے خاندانی اعزاز میں کوئی حقیقی یا خیالی کمی گوارا کرتے ملازمت سے دست کش ہوئے۔

شوخی اور طنز و ظرافت حالی نے غالب کے متعلق یہ لکھ کر غلطی نہیں کی کہ انہیں حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ غالب کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی یہی شوخی و ظرافت ہے۔ اس شوخیٔ ظرافت نے ان کے دل کے داغوں کو بھی "سرو چراغاں" بنا دیا ہے۔ غالب کی زندگی کے واقعات ان کے ظریفانہ لطائف سے بھرے پڑے ہیں۔ اس ظرافت و حاضر دماغی نے انہیں کئی مصیبتوں سے بچایا بھی ہے۔ مثلاً کرنل براؤن کا واقعہ۔ غالب کی زبان سے جو بات نکلتی وہ ظریفانہ ہوتی۔ ان کے اشعار میں اور ان کی نثر میں ہر جگہ ان کی ظرافت جھلکتی ہے۔ ان کے خطوط میں بھی یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ایک خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں کہ "دھوپ تیز ہے روزہ رکھتا ہوں مگر اس کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ میں روزہ نہیں رکھتا"۔ اسی طرح ایک اور خط میں بارش کی شدت کا ذکر اس مذاحیہ انداز میں کرتے ہیں کہ بادل دو گھنٹے برستا ہے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔

حالانکہ اردو شاعری میں غالب سے پہلے بھی شوخیٔ بیان کے نمونے ملتے ہیں مگر وہ سطحی مسخرگی اور ہجو وغیرہ تک ہی

محدود ہیں۔ غالب نے شوخی بیان میں شستہ اور لطیف انداز اختیار کیا ویسے تو ان کا سارا کلام ہی سراپا شوخی ہی شوخی ہے مگر انہوں نے نچلے درجہ کی اور سطحی شوخی سے کبھی اپنی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ غالب اتنے شوخ ہیں کہ انہوں نے خدا کو بھی نہ چھوڑا اور اسکی بنائی ہوئی جنت اور فرشتوں تک سے شوخیاں کرتے ہیں ان سے پہلے کسی شاعر نے اس انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ کہتے ہیں ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

•

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

•

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے اگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

رند مشرب شاعروں اور زاہدوں کی تو ازلی دشمنی ہے مگر غالب نے جو اشعار زاہد سے متعلق کہے ہیں ویسی شوخی کہیں اور نظر نہیں آتی۔ کہتے ہیں ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

•

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

طنز کی پستی یا بلندی کا انحصار اس بات پر ہے کہ شاعر یا ادیب کس سطح سے طنز کرتا ہے اور کس مقصد کو سامنے رکھکر۔ اصل معنوں میں غالب ہی اردو ادب میں طنز و ظرافت کے بانی ہیں۔ ان کے طنز کا وار معمولی یا روایتی اداروں یا شخصیتوں کے لئے نہ تھا بلکہ زندگی درمانہ اس کے ہدف تھے۔ اور تو اور انہوں نے خدا کو بھی نہ چھوڑا کہتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

•

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

۲۔ جدت پسندی و انفرادیت:

غالب کی طبیعت اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ وہ ہمیشہ پرانی روش پر چلنا کسرِ شان سمجھتے رہے ان کی سیرت اور شاعری کا نمایاں پہلو ان کی جدت پسندی اور انفرادیت ہے۔ صرف شاعری ہی میں نہیں بلکہ رہن سہن اور وضع قطع میں بھی وہ انفرادیت کے قائل تھے۔ ان کے کلام میں ان کے زمانے کے تہذیبی اثرات بھی ہیں اور شوخی و رندی بھی۔ اخلاقی قدریں بھی، تصوفانہ رنگ بھی لیکن وہ ان میں کسی ایک کے پوری طرح پابند نہیں ہیں۔ وہ فلسفیانہ شعر کہتے ہوئے بھی فلسفی شاعر نہیں ہیں جن معنوں میں اقبال ہیں اور تصوفانہ شعر کہتے ہوئے بھی میر کی طرح صوفی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے ہمعصر شعرا اپنی روایات، تہذیب اور رنگین مگر سطحی زندگی سے بیزار یا باغی نہ تھے مگر غالب ان باتوں سے سخت برہم اور بیزار تھے۔ غالب رسوم و قیود کی تقلید کے باغی تھے۔ ذیل کے اشعار انکی باغیانہ ذہنیت، جدت پسندی اور انفرادیت کی دلیل ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں ؎ جانا کہ ایک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے
طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ ؎ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ؎ کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

غالب جس دور میں سانس لے رہے تھے وہ ادبی و سماجی شکنجوں میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ تقلید کے بغیر کوئی شخص جی سکتا تھا نہ مرنے کا تصور کر سکتا تھا۔ ادب اور شاعری میں بھی بغیر تقلید کے زندگی کا کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ اس دور میں غالب نے ایسے باغیانہ اور جدت پسند اشعار کہے ہیں تو یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان کا ذہن ان کے اپنے دور کا ذہن نہیں بلکہ ایک ایسے دَور کا نقیب ہے جو بے جا رسوم و قیود کی پابندیوں سے گھبرا کر ساری زنجیروں کو توڑ دینے پر تُلا ہوا تھا۔

غالب کی جدت پسندی نے ان سے ایسے اشعار کہلوائے جن میں ایک سے زیادہ مفہوم پیدا ہوں۔ ان کے اشعار میں معنی و مطالب کا ایک ایسا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملیگا جسکی پنہائیوں اور گہرائیوں کو دیکھ کر ہم کو غالب ہی کی زبان سے یہ اعتراف کرنا پڑے گا ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ان کے یہ چند اشعار اس خصوصیت کے غماز ہیں ؎

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ✧ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

بادہ نوشی ہے باد پیمائی ✧ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

بجز گر جز نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا ✧ گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا

غالب نے ایک صدی پہلے ہی ان حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا تھا جو حقیقتیں آجکل کے جدید شعراء کا موضوع سخن بنی ہوئی ہیں۔ غالب کی جدت پسندی ایسی ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ ان کے کلام کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق معنی پہنا کر لطف اندوز ہو سکیں۔ غالب کے خطوط میں بھی یہی جدت طرازی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے فرسودہ طرز خط و کتابت، کو چھوڑ کر نیا انداز اپنایا۔ ان کے خطوط لکھنے کا انداز ایسا ہے جیسے دو اشخاص آپس میں بات چیت کر رہے ہوں۔ اردو ادب میں یہی پہلے خطوط ہیں جن میں لفاظی کا جنون نہیں ہے اور جن میں وقت اور فاصلہ کے احساس کو تھوڑی دیر کیلئے مٹا دیا گیا ہے۔

۴۔ رندی :

وہ چیز جس کیلئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

غالب کا ذکر بغیر شراب کے ذکر کے ناممکن ہے کسی انسان کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں ماحول کافی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ غالب کو اقبال کی طرح شروع ہی سے مذہبی اور اعلیٰ ماحول میسر نہ ہوا اور نہ میر کی طرح تصوفانہ خیالات و ماحول اسلئے وہ معتقد میسر ہوتے ہوئے متبرّ نہ بن سکے۔ غالب کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کے ہاں "شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب" کا امتزاج ملتا ہے۔ اسلئے شروع ہی سے ان کے ہاں جرأت رندانہ اور شوق فضول کی کمی نہیں، حالانکہ تمام نہیں تو بہت سے شعراء بادہ نوش ہی گذرے ہیں مگر غالب سا رند مشرب شاید ہی کوئی ہو۔ انہوں نے اپنے کلام میں جتنا کچھ شراب کے متعلق لکھا ہے وہ حافظ و شیرازی سے کم نہیں حالانکہ بحیثیت شاعر اور رند مشرب انہوں نے شراب کی جا بجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ بادہ نوشی کو برا سمجھتے تھے مگر ساری عمر وہ اس کو نہ ترک کر سکے یا شراب انہیں نہ چھوڑ سکی۔

جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ویسے انہوں نے اپنی اس عادت پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہ کی اس بادہ نوشی کے سلسلہ میں بھی کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ایک شخص نے غالب سے کہا کہ مرزا صاحب کیا آپ نہیں جانتے کہ بادہ نوش کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ بھائی جس شخص کو بادۂ گلفام میسر ہو وہ اور کس چیز کے لئے دعا مانگے گا۔

ان کی بادہ پرستی کا اندازہ ان کے اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ٭ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

۵۔ مذہب اور غالب:

باوجودیکہ غالب اسلام کی حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے انہوں نے ظاہری عبادات میں صرف توحید و رسالت پر یقین کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھا۔ ان کے آخری ایام میں ان پر سخت اعتراضات ہونے لگے اور انہیں کافر کہا جانے لگا۔ حالی نے جو ان کے شاگرد تھے ان سے درخواست کی کہ چند دن تو عبادت کر لیجئے۔ غالب نے اس بات کا جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے اور قابلِ ستائش بھی۔ انہوں نے کہا کہ ساری عمر نہ نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ اب زندگی کے آخری نفوس میں اشاروں سے عبادت کر بھی لوں تو زندگی بھر کے گناہوں کی تلافی کیسے ہوگی۔ اس جواب میں غالب کی مستقل مزاجی جھلکتی ہے۔ ویسے غالب اپنے آپ کو موحدِ خالص اور مومنِ کامل سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ خدا انہیں دوزخ میں ڈالیگا بھی تو اس سے ان کو جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ وہ دوزخ کا ایندھن بنکر اسکی آگ کو مشرکین کے جلانے کیلئے تیز کر دینگے۔

غالب دوزخ کی آگ تیز کریں گے یا شرابِ طہور کا لطف اٹھائیں گے یہ خدا ہی جانے ویسے ان کی شخصیت و سیرت کا ہر پہلو دلچسپ ہے۔ غالب ماضی میں بھی عظیم تھے حال میں بھی عظیم ہیں اور مستقبل میں بھی عظیم رہیں گے کیونکہ انہوں نے انسانی تہذیب اور شائستگی کو پوری طرح اپنے اندر ضم کر لیا ہے انہوں نے ہر غم کا مقابلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ انسان چاہے تو غم کے اندھیروں میں بھی مسرت کی قندیلیں روشن کر سکتا ہے۔ غالب کسی ایک دور کے نہیں بلکہ ہر آنے والے دور کے شاعر ہیں۔ اور خود اپنے بیان کے مطابق ایک "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" ہیں۔ —— ▲

میرے پسندیدہ اشعارِ غالب —— نور جہاں۔ بی اے (سال سوم)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تمہارے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پروین فاطمہ
بی اے (سال اول)

غالب کے خصائل

مرزا صاحب ولایتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے مرزا عالم شباب میں اور بڑھاپے میں بھی دلی کے حسین اور خوش رو آدمیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مرزا لمبے چوڑے اور خوبصورت آدمی تھے۔ قد کشیدہ تھا اور رنگ سفید و سرخ، ہاتھ پاؤں سڈول داڑھی پہلے خشخشی تھی بعد میں بڑھالی تھی۔ آپ رئیس خاندان سے رہنے کے سبب آپ کا لباس بھی رئیسوں جیسا ہی تھا۔ مرزا نے کبھی اپنی وضع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ ہمیشہ پاجامہ، کرتا اور چوغہ پہنتے تھے۔ جب بال سفید ہونا شروع ہوئے تو سر منڈوانے لگے۔ اور ایک خاص وضع کی پوستین کی اونچی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اور آپ سر پر کبھی کبھی مغلی انداز کا بنکا بھی باندھتے تھے۔ جاڑوں کے موسم میں گرم کپڑے پہنتے تھے۔

مرزا صاحب کھانا کم اور لذیذ کھاتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی ہمیشہ صبح میں نہار بیٹ کوئی ٹھنڈی چیز ضرور پیتے تھے۔ اور اس کے بعد پہر دن چڑھے ناشتہ کرتے تھے۔ دوپہر کے کھانے میں ہمیشہ گوشت کھاتے تھے۔ گوشت سے بے حد رغبت تھی۔ گوشت تازہ اور بے ریشہ دار کھاتے تھے۔ مرزا کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ گوشت میں یا جو سالن یا ترکاری پکی ہو اس میں تھوڑی سی چنے کی دال ضرور ڈلواتے تھے۔ چنے کی دال کے بارے میں مرزا کی بیگم کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے مرزا کی بیگم کو چنے کی دال بالکل پسند نہ تھی جب وہ رخصتی کے بعد گھر آئی تو ان کی خاطر گوشت میں دال نہ ڈالی گئی۔ جب مرزا صاحب کھانے پر بیٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ سالن میں دال نہیں پڑی ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید گھر میں دال ختم ہو چکی ہوگی اسلئے وہ کہنے لگے کہ بھئی اگر دال ہو چکی تھی تو یا خود کسی کو بھیج کر منگوائی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا کہ میں منگوا دیتا۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ دال تو گھر میں موجود ہے لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی اسلئے سالن میں نہیں ڈالی گئی۔ مرزا صاحب تو بیٹے ہی بذلہ سنج تھے جھٹ سے بول اٹھے کہ "اوہو، پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئیں چنا تو وہ چیز ہے کہ خود اللہ میاں کی رال بھی ٹپک پڑتی ہے جب بہو چنے کی دال نہیں کھاتی تو خدا سے بھی بڑی ہوئیں۔ ان کی بات سن کر ان کی بیگم بہت شرمندہ ہو گئیں۔ اس وقت سے چنے کی دال کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اگر چنے کی دال کسی سالن میں ڈالی ہو تو بھی ان کی بیگم اسکو الگ کر کے

کھا لیتی تھیں۔ آپ اچھے قسم کے چاولوں کے دلدادہ تھے۔ دوپہر کے کھانے میں گوشت کے ساتھ روٹی بھی کھاتے تھے۔ کھانا ہر وقت ایک ہی وقت کھاتے تھے رات کو کبھی نہیں کھاتے تھے۔ آپ کو پھلوں میں انگور اور آم بہت پسند تھے۔ آم تو حد سے زیادہ پسند تھے۔ غالب کو بنگال کے آم بہت پسند تھے۔ غالب ایک جگہ آموں کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ہمہ گر میوہ فردوس بخوانت باشد
غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

اس کا مطلب یہ ہے کہ بنگال کا ایک آم جو مزے اور کیف میں بہت بہتر ہوتا ہے اور بہت مشہور ہے اسکی تعریف کر رہے ہیں کہ اگر میرے دستر خواں پر فردوس کے تمام میوے موجود ہوں تب بھی اے غالب بنگال کے اس آم کو نہ بھولنا چاہیے۔ گویا تمام قسم کے میوے ہوتے ہوئے بھی اور وہ آم نہ رہا تو سب ہیچ ہیں۔

آپ حقہ بھی پیتے تھے مگر پان نہیں کھاتے تھے۔ آپ شراب کے اتنے عادی تھے کہ روزانہ پاؤ بھر کے قریب پیتے تھے۔ آپ اگر ایک وقت شراب نہ پیتے تھے تو آپ کو نیند نہیں آتی تھی۔ شراب کی حدت اور تیزی کم کرنے کیلئے اس میں دو تین حصے گلاب ملا کر پیتے تھے۔ آپ خود شراب کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست ؛ آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مطلب یہ (غالب کا دل آسودہ ہو کیونکہ بادۂ صافی میں گلاب ملانا ان کی عادت ہے)

شراب کے بارے میں میر مہدی مجروح کا ایک شعر ہے۔ ؎

غالب آئے ہیں لاؤ اے مجروح ؛ بادۂ ناب میں ملا کے گلاب

آپ زیادہ شراب رات میں پیتے تھے۔ اپنی شراب نوشی کی توجیہہ ملاحظہ ہو۔ ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ؛ اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئیے

غالب ہمیشہ ولایتی فرنچ شراب پیتے تھے۔ گر پھال کی دیسی شراب انھیں پسند نہیں تھی ایک شعر میں دیسی شراب کی شکایت کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

غالب شراب قندی ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

مطلب: قند ہندی کی شراب یعنی گڑ کی شراب نے مجھ کو کباب کر دیا ہے یعنی جلا دیا ہے اسکے بعد بہترین شراب کشید کرنا چاہئے۔
غدر کے زمانے میں انھیں بہت تکلیف ہوئی شہر میں ولایتی شراب کم ہو گئی اس کی قیمت بہت بڑھ گئی۔

مرزا کی آمدنی بہت قلیل رہنے کے سبب وہ اتنے مہنگے داموں میں شراب نہیں خرید سکتے تھے۔ اس وقت ان کے ایک دوست انھیں دیسی شراب تحفے کے طور پر پیش کی وہ رنگ و بو میں ولایتی سے کم نہیں تھی۔ اس کو مرزا نے بہت پسند کیا۔

آپ جب دلی آئے تو تھوڑے دنوں تک سسرال میں رہے اسکے بعد جلد ہی اپنا مکان الگ بنالیا۔ ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ کبھی اپنا خاص مکان نہ بنایا نہ خریدا۔ آپکی آمدنی بہت قلیل تھی۔ حوصلہ فراخ تھا۔ کوئی سائل آپکے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ مرزا غالب بہت نازک مزاج تھے۔ مرزا کو جانور پالنے کا بڑا شوق تھا۔ آپکے پاس گھوڑے، بلی، مور، کبوتر، بکری وغیرہ تھے۔

غالب میں چار خصوصیتیں موجود تھیں علم، قدرت زبان، تخیل، استقلال۔ مرزا کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہیں ہوتی تھی۔

مولانا حالی نے فرمایا ہے کہ غالب کو "حیوان ناطق" کے بجائے "حیوان ظریف" کہیں تو بہتر ہے۔ ظرافت ان کی فطرت کا بہت بڑا جزو ہے۔ ان کا دماغ بہت تیزی سے کام کرنے کی وجہ سے جلد ہی کچھ نہ کچھ سوجھ جاتا تھا۔ جب کوئی نہ کوئی بات ذہن میں آجاتی تو اسے کہنے سے رکتے نہیں تھے۔ خواہ مخاطب کوئی ہو۔ غالب اتنے خوش مزاج ہونے کے باوجود یاس و حسرت آپکے کلام میں اس قدر موجود ہے کہ پڑھنے والا خود ہی تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ غالب نے جس حال میں زندگی گذاری ہے اسکی صحیح عکاسی ان کے اشعار کے ذریعہ بھی کی جا سکتی ہے۔ رنج و غم کے بارے میں خود ہی کہتے ہیں ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم ؞ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مرزا صاحب کا حافظہ بہت قوی تھا۔ شعر فہمی اور نکتہ سنجی میں یکتا تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون کیوں نہ ہو ایک ہی سرسری نظر میں اس کو سمجھ جاتے تھے۔ مرزا کی تقریر ان کی نظم و نثر سے پُر لطف تھی۔ اسی وجہ سے لوگ آپ سے ملنے اور باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ آپ زیادہ بولنے والے نہ تھے۔ مگر جو کچھ آپ کی زبان سے نکلتا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت اور حاضر جوابی لاجواب تھی۔ آپ کے لطیفے مشہور ہیں جو آزاد اور حالی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔

مرزا کے اخلاق نہایت بلند تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ آپ بڑے ہمدرد اور خلیق تھے آپکا حوصلہ فراخ تھا۔ آپ ہر ایک استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ مرزا نے اپنے اساتذہ قدیم کو چراغ سے اور اپنے آپ کو آفتاب سے کم نہیں سمجھا وہ ان کی ہر طرح کی بہتری اور بہبودی کے خواہاں تھے۔

مرزا غالب نے فارسی اور اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ مرزا کا کلام مبالغوں سے پاک اور حقائق پر مبنی ہے۔ آپ ایک بڑے فلسفی شاعر تھے اور آپکا کلام فلسفہ اور تصوف سے بھرا ہے۔ آپ میں قوت متخیلہ اور ملکۂ شاعری حد درجہ تھا۔ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو نہایت خوبی اور لطافت سے اردو اور فارسی زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ جدت مضامین، بلندی خیالات، شوخی و ظرافت، حسن بیان اور معنی آفرینی آپکے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ آپ اردو خطوط نگاری کے بانی اور جدید اردو نثر کے پہلے ادیب مانے جاتے ہیں۔ ——▲

مہ جبین۔ پی یو سی

مرزا غالبؔ کی خصوصیّات

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے

مرزا غالبؔ کا خاندانی سلسلہ افراسیاب تک پہنچتا ہے۔ غالبؔ کا بچپن ناز و نعم میں گذرا۔ اوائل عمر میں ہی والدین اور چچا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور اس کے عوض پنشن مقرر کی گئی۔ ۱۳ سال کی عمر میں ان کی شادی مرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے ہوئی، مرزا نے دلی میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بچپن ہی سے طبیعت شاعری کی طرف مائل رہی ہے۔ پہلے پہل اسدؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کر لیا۔ ایام غدر میں حادثات زمانے کا شکار ہو گئے۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد مقرر ہوئے۔

غالبؔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت بلند تھے۔ نہایت متین، نہایت فیاض خود دار اور باوضع تھے۔ دوستوں سے ملنا جلنا اور خطوط لکھنا ان کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ اس کا یہی ثبوت ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اردوئے معلّٰی کے نام سے مشہور ہے جن میں غالبؔ نے تمام خطوط اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھے ہیں۔ دوستی کرنا مرزا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ نہایت خوش اخلاق کیا ہندو کیا مسلمان ہر ایک سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ مرزا کی ایک اور سب سے نمایاں خصوصیت ظرافت اور شوخی تھی۔ ان کی ظرافت پر حالیؔ نے انہیں حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف کہا ہے۔ غالبؔ کے خطوط اور شاعری ان کی زندگی اور خصوصیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ غالبؔ کی ایک اور خصوصیت جدّت و انفرادیت ہے جس طرح نثر نگاری اور شاعری میں جدّت پیدا کرتے تھے اسی طرح ان کی طبیعت بھی اسی قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ ہر بات میں عوام سے مختلف رہنا چاہتے تھے۔ اسکے متعلق ان کا مشہور واقعہ ہے۔ انکے زمانے میں عوام میں داڑھی منڈوا کر سر کے بال چھوڑنے کا فیشن زوروں پر تھا۔ غالبؔ کی طبیعت کی انفرادیت دیکھئے کہ انہوں نے فوراً اپنے سر کے بال منڈوائے اور داڑھی چھوڑ لی، ایسی ہی انفرادیت و جدّت غالبؔ کے کلام اور نثر میں بھی ملتی ہے غالبؔ سے پہلے عبارت بالکل مرصع و مسجع ہم قافیہ لکھی جاتی تھی مگر غالبؔ کی طبیعت کی انفرادیت نے نثر کی بنیاد بالکل ہی نئے انداز پر رکھی۔ انہوں نے مرصع و مسجع عبارت کا بالکل ہی بائیکاٹ کر دیا اور اپنے ہی طرز کی نئی عبارت لکھنی شروع کی بعد میں چل کر سب نے ان کی تقلید کی۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اگر غالب شاعر نہ بھی ہوتے تو انہیں ان کی نثر نگاری کی بدولت وہی شہرت نصیب ہوتی جو ان کے کلام کی وجہ سے ہے۔ غالب کی یہ جدت بھی ایک بہت بڑی خصوصیت کی حامل ہے۔

غالب کی طبیعت میں خودداری کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے آلام و مصائب کے زمانے میں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ جب وہ دہلی کالج کی ملازمت کے سلسلے میں جب سکریٹری سے ملنے گئے تو باہر ہی کھڑے انتظار کرتے رہے تاکہ سکریٹری انہیں لینے آئے۔ اور وضعداری کا تو یہ حال تھا کہ وہ صرف انہیں دوستوں سے ملا جلا کرتے تھے جو ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ غالب کی خودداری کا تو یہ حال تھا کہ اگر وہ کعبہ جائیں اور درِ کعبہ اگر کھلا نہ ہو تو اس کو کھٹکھٹانے اپنی خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ خودبین و خودآرا ہیں کہ ہم ؎ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس کے علاوہ غالب میں حق پسندی، راست گفتاری رچ بس گئی تھی۔ یہ وہ چیز جو اُن کی طبیعت و عادت کے خلاف ہو کہہ دینے سے باز نہ آتے تھے۔ عام انسان جبکہ دوسروں پر نکتہ چینی کرتا ہے وہاں اپنی برائیوں کی پردہ پوشی کر لیتا ہے مگر انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ دوسروں پر انگلی اٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھ لے کہ وہ کس حد تک نیک و بد ہے۔ یہ انسانی عظمت ہمیں غالب کے پاس ملتی ہے۔ جہاں غالب زاہد پر چوٹ کرتا ہے ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جنت کے رسمی تصور پر ہنستا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ؎ دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

وہاں خود پر بھی چوٹ کرتے ہوئے نہیں چوکتا ؎

چاہتے ہو خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

جس طرح غالب کی نظم و نثر میں شوخی و ظرافت کارفرما تھی یہی خصوصیت ان کی گفتگو میں بھی نمایاں تھی۔ مثلاً مرزا کو کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت مرزا کے سر پر ٹوپی تھی۔ مرزا کی یہ وضع دیکھ کر کرنل نے پوچھا "ویل تم مسلمان ہو" مرزا نے کہا "آدھا" کرنل نے اس کی وضاحت طلب کی تو مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔" اسی طرح کے بہت سے

لطائف ہیں غالب کے ہاں ملتے ہیں، غالب کی یہ خصوصیت ہیں ان کی نظم و نثر سے بھی جھلکتی ہے۔ مثلاً ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

شراب خوری نے ان کی حالت اس درجہ تباہ کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو وہ پائی پائی کے مقروض تھے۔ اور غم روزگار نے اتنا تنگ کر دیا تھا کہ ان چیزوں سے بے خود ہو جاتے تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئیے

اسکے علاوہ جوسر بازی اور مذہب و ملت سے بے پرواہی بھی غالب کے عادات میں تھی، لہٰذا فرماتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالب میں آزادی رائے اور خود اعتمادی کا جذبہ موجود تھا، اس لئے وہ ایسی جنت کو دوزخ میں ڈال دینے کے قائل تھے جس کی خواہش صرف وہاں کی نعمتوں کے لالچ میں کی گئی ہو۔ کہتے ہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

وفاداری کے متعلق ان کا ایمان یہ ہے کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

غالب حالانکہ شراب پیتے تھے، مذاہب و ملت سے بے پرواہ تھے مگر ان کے انداز میں ایک مومن کا انداز کارفرما تھا۔ شراب کے نشہ میں بہک کر انہوں نے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہی بلکہ "مشاہدۂ حق" کی گفتگو ہی کی ہے۔ اسی لئے خود ہی کہتے ہیں ع
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔ ان کے نظم اور خطوط میں اُن کی پوری زندگی کا نقشہ ملتا ہے۔ ان کی شخصیت ان کی شہرت، شاعری، ان کے خطوط، ان کی نثر، ان کی سیرت و عادات — اُن سب کے گُن گائے جاتے رہیں گے۔ غالب کی حیات، حیاتِ جاوداں ہے۔ وہ اس برادری میں شامل ہیں جنکی عمر پر موت کا کوئی اثر نہیں پڑتا ——— ▲

فہمیدہ نازنین
پی یو سی۔

کلامِ غالب پر ایک نظر

آسمانِ ادب پر بہت سے ستارے چمکے اور اپنی ضیا پاشی سے شاعری کی دنیا کو منور کر گئے۔ مثلاً میر، سودا، ذوق، داغ وغیرہ، میر کو امامِ غزل کہا گیا تو ذوق کو قصیدوں کا بادشاہ مانا گیا۔ حضرت داغ کا شمار بھی مشہور شعراء میں ہوتا ہے اور انہیں علامہ اقبال کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مگر اسکے باوجود میدانِ شاعری کا ایک اور شاعر جسے دنیا مرزا غالب کے نام سے یاد کرتی ہے ان تمام شعراء پر سبقت لے گیا۔ صحیح معنوں میں غالب دوسرے شاعروں پر غالب آگیا۔

غالب کو عام شاہراہ پر چلنا پسند نہیں تھا جس پر پچھلے تمام شعراء چلے آرہے تھے پچھلے شعراء ایک ہی مضمون کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ باندھتے تھے۔ اردو میں غزل کی ابتداء سے لیکر آج تک بے شمار غزل گو شعراء پیدا ہوئے لیکن ان سب کے کلام میں ہم کو ایک ہی قسم کی یکسانیت ملتی ہے، مگر غالب کی طبعیت کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ انہوں نے عامیانہ خیالات سے ہمیشہ گریز کیا۔ اس لئے ہمیں غالب کے کلام میں ایک قسم کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ غالب کی ابتدائی شاعری پر فارسی کا رنگ زیادہ غالب رہا ہمیں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں فارسیت زیادہ ہے مثلاً ؎

کاوِ کاوِ سخت جانہائے تنہائی نہ پوچھ ؛ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ؛ تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

اسی طرح کا کلام عوام کے دلوں کو نہ بھایا، کیونکہ اس زمانے میں لوگ سیدھا سادا کلام سننے کے عادی تھے لہٰذا اس وقت ان کا کلام مقبولِ عام نہ ہو سکا۔ چنانچہ انہوں نے اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی۔ حکیم آغا جان عیش نے ان کے کلام پر اس طرح چوٹ کی ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے ؛ مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے ؛ مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

غالب نے ان اعتراضات کا جواب اس طرح دیا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن یہ اعتراضات بجا تھے۔ اسی قسم کی نکتہ چینیوں نے مرزا کو یہ احساس دلایا کہ ان کی فارسی شاعری مقبول عام نہ ہو سکے گی لہٰذا ان کی طبیعت دھیرے دھیرے اردو کی جانب مائل ہوتی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی طبیعت کی انفرادیت اور جدت نے اردو شاعری میں نئے نئے گل کھلائے۔ اور ان کا شمار مشاہیر شعرائے عالم میں ہونے لگا۔ فارسی کا دلدادہ غالب جو یہ کہتا تھا کہ

ع　فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

اردو کلام کی وجہ مقبول ہونے لگا تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی　؎　گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کی غزل کے خاص خصوصیات ہیں جدت، لطافت، ظرافت، رشک، عشق و محبت اور ان کے علاوہ غالب کے ہاں بیشتر اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں خیالات تو پرانے ہیں مگر کوئی نیا پہلو لا کر جدت پیدا کر دی گئی ہے۔ مثلاً

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کے کلام میں جو لطافت اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ ظرافت کے احساس کی بنیاد ہے۔ غالب کے پاس ہمیں قہقہے نہیں ملتے بلکہ زیر لب مسکراہٹ ملتی ہے جو بعض جگہ اپنے اندر طنز لئے ہوئے ہوتی ہے۔ ظرافت اور شعراء کے ہاں بھی ملتی ہے مثلاً سودا، انشاء، نظیر اکبر وغیرہ یہ سب ہنستے ہنساتے ہیں مگر غالب کے مقابلے میں ان کی ہنسی کچھ ہیچ سی معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی ظرافت میں ذہنی انبساط کارفرما ہے مثلاً ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی　؎　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اور ایک جگہ واعظ کا مذاق اڑاتے ہیں ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ　؎　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے کلام کی مقبولیت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب ان کی زندگی میں خود مرزا ہی کے ایما سے ہو گیا تھا۔ حالی کی "یادگار غالب" نے غالب کو عوام سے روشناس کرایا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اپنی تصنیف "محاسن کلام غالب" میں لکھتے ہیں :-

"ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ ایک مقدس وید، دوسرا دیوان غالب" آگے چل کر لکھتے ہیں لوح سے تمت تک۔

مشکل سے تنو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں نہیں ہے کونسا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار موجود نہیں ہے"۔

غالبؔ کا کلام علمی لحاظ سے ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانے کا سرچشمہ ہے۔ ادبی حیثیت سے دیوانِ غالبؔ فصاحت اور لطافت میں یکتا ہے۔ یہ مختصر مجموعۂ انتخاب اپنی مثال آپ ہے۔ صوفی اس کے کلام میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ مشکل پسند لوگ ان کی دقیق اور پیچیدہ ترکیبوں پر سر دھنتے ہیں۔ غالبؔ کا منتخب کلام ان کے طرز کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔

نیاز فتح پوری اپنی تصنیف "مشکلاتِ غالبؔ" میں تحریر کرتے ہیں:-

"غالبؔ کے یہاں اتنے مختلف رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں کہ ہم اس کے دیوان کو زنجیر فرض کریں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئیگی اور کوئی کڑی کسی رنگ کی"۔

غالبؔ نے خود اپنی شاعری پر زعم کرتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے ؛ کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

غالبؔ نے بعض جگہ اپنے آپ پر بھی چوٹ کی ہے ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالبؔ ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ؛ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ فطرتِ انسانی کے نباض تھے، ان کی نفسیاتی گہرائی خاص طور سے مقبول ہے۔ غالبؔ نے مناظرِ قدرت کی تصویر نہیں کھینچی۔ عاشق و معشوق کے دل کی کیفیت نظم کی ہے، انہوں نے زندہ جذباتِ انسانی کی عکاسی کی ہے۔ اسکی زندہ جاوید مثالیں ہیں ؎

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

غالبؔ کے کلام کی ایک اور خصوصیت پہلودار اشعار، خیال اکثر بلند اور لطیف ہوتا ہے اور الفاظ میں اس کا صرف ایک پہلو ہی ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے پہلو کی طرف ذہن ہی منتقل ہو سکتا ہے ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق ؛ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کے اشعار میں ہمیں ایک ایسی سادگی ملتی ہے جو اپنے انداز لطیف معنی لئے ہوتی ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ٭ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

درد منت کش دوا نہ ہوا ٭ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی ٭ میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کچھ لوگوں کے خیال میں شاعری مصوری ہے اور چند کے خیال میں شاعری موسیقی ہے۔ مگر غالب کے ہاں مصوری اور موسیقی دونوں کا امتزاج ہے۔

غالب کا کلام ایک ایسا سمندر ہے جس میں قاری کو غوطہ لگا کر موتی نکالنا پڑتا ہے یعنی معنی معلوم کرنے کیلئے قاری کو گہرائی کی تہہ تک پہنچنا پڑتا ہے عشق و محبت غزل کا ایک مخصوص موضوع ہے۔ غالب نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے عشق و محبت سے متعلق کئی قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً عشق کے متعلق ان کا خیال ہے ؂

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

ع کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا ـــــ عشق و محبت کے متعلق ان کی ایک نہایت ہی موثر اور مشہور غزل ہے ؂

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اس کے علاوہ غالب کے کلام میں " رشک " بھی ایک اہم چیز ہے، کہتے ہیں ؂

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

مرزا کی شاعری کا ایک پہلو ہے "شراب" انہوں نے شراب سے متعلق سینکڑوں شعر کہے مگر ہر شعر میں ایک نیا انداز کارفرما ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؂

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

انہوں نے بادہ و ساغر کی آڑ میں "مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انہیں کے قلم سے بے ساختہ نکلا ہے ع

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کے کلام میں انسان کا ایک دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں ہمیں اپنے ہی دل کی گونج سنائی دیتی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کا جو اس نے کہا

ہم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی لذت تقریر سے ہر دل متاثر ہوتا ہے اور یہ غالب کی عظمت ہے۔ غالب کی زندگی اور شاعری پر اتنی کتابیں رسالے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اردو اور فارسی کے شاید ہی کسی شاعر پر لکھے گئے ہوں۔

پروفیسر محمد حنیف کلیم
ریڈر، صدر شعبۂ اردو فارسی
مہاراجہ کالج میسور یونیورسٹی

"فکر و فن"

چمن کی آبرو زاغ و زغن نہیں ہوتے
بغیر ظرف کہیں فکر و فن نہیں ہوتے
ہوس نصیب حیات و ممات کیا جانیں
سبھوں کے واسطے دار و رسن نہیں ہوتے

غزل

جن خیالوں میں جھول ہوتے ہیں
سلسلے ان کے طول ہوتے ہیں
صاحبِ علم ہو کہ صاحبِ زر
ان کے اپنے اصول ہوتے ہیں
سبزۂ گلشن نہیں ہے راہ روی
راستوں میں ببول ہوتے ہیں
وقت زخمِ جگر کا مرہم ہے
لوگ ناحق ملول ہوتے ہیں
ہم سے کتنے ہیں شہرِ خوباں میں
جن کے تحفے قبول ہوتے ہیں
سب کو خوشبو کہاں نصیب ہوئی
خوشنما سارے پھول ہوتے ہیں
وہ جو پروردۂ خزاں ہیں کلیمؔ
وقفِ رنگِ گل کے رسوا ہوتے ہیں

پروفیسر سراج الحسن سراج ادیبی
شعبۂ اردو فارسی مہاراجہ کالج۔ میسور یونیورسٹی

غزل

زلف و عارض کی جب چھڑیں باتیں
جاں فزا ہو گئیں ملاقاتیں
وہ جمالِ جہاں فروزاں کا
فرحت آثار ان کی وہ باتیں
کیف آور وہ صحبتیں ان کی
وہ بہار آفریں مداراتیں
یاد بے اختیار آتی ہیں
وہ شبِ ماہ تاب کی باتیں
زندگی کی بہار لاتی ہیں
جب بھی آتی ہیں چاندنی راتیں
وہ وفا اور خلوص کے تحفے
مہر و الطاف کی وہ سوغاتیں
روح پرور وہ التفات ان کا
دلربا ان کی وہ ملاقاتیں
پئے تکمیلِ آرزوئے طرب
وہ مسلسل مری مناجاتیں
دل میں لیتی ہیں چٹکیاں اب بھی
عہدِ عشرت کی وہ حسیں راتیں
کس طرح ہوں گی دل سے محو سراجؔ
ان کی وہ کیف زا ملاقاتیں

انیس ہدایت
بی ایس سی (سال دوم)

غالب کی غزل سرائی

غزل دنیائے دل کی چیز ہے اس میں سوز دل کیطرح دل کی ہر کیفیت کا بیان ہو سکتا ہے۔ غالب کی غزل سرائی کا معیار دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔ ان کی غزل کا موضوع ہر چند جذبہ محبت ہے۔ مگر اس جذبہ کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع ہے۔ کہ لطف بیان کی طرح اس کے ہزاروں رنگ ڈھنگ ہیں۔ غالب سوز و ساز کو ترکیب دے کر غزل کیلئے نیا موضوع پیدا کئے۔ غالب کے فن اور ان کی شاعری کی حقیقت کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ ان کی غزل کا موضوع نہ دل ہے نہ کہ دماغ۔ غالب فنکار رہتے ہوئے بھی ایک پر عظمت شاعر ہیں۔ ان کے فن کی بلندیاں ان کے جذبات کی گہرائیاں ہیں اور ان گہرائیوں تک پہنچنا بہت کٹھن ہے۔ اس لئے آپ کی مشکل پسند شاعری سے لوگ بہت نالاں تھے۔ مگر عوام کا کہنا ہے غالب کے ہاں جذبات نہیں، کوئی شاعری جذبات کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔ غالب کی شاعری کامیاب شاعری ہے۔ اس میں خلوص اور جذبات کے رنگ ہیں۔ جو انہوں نے دل و دماغ کے موزوں امتزاج سے اپنے شعر کا مزاج تیار کیا ہے۔ اس میں فن ہے، جذبہ ہے، سوز ہے اور ساز بھی ہے۔ ناز ہے نیاز بھی ہے۔ غالب کی مقبولیت کا اصل راز یہی ہے کہ وہ انقلابی شاعر ہیں۔ گو اردو غزل کی روایات میر سے قائم ہوئیں اور یہ اس اعتبار سے انقلابی شاعر بھی ہیں۔

یوں تو غالب نے شعر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ان کا اصل میدان جس میں انہوں نے اپنی شوخ طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہیں وہ غزل ہے۔ ان کے فنکارانہ کمالات کا اظہار دوسری صنف سخن کے مقابلہ میں زیادہ تر غزل ہی میں ہوا ہے۔ اس منزل کو حاصل کرنے کیلئے، آگے بڑھنے کیلئے بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک ہمت، دوسرے توفیق۔ ہمت فن کار کی اپنی باطنی قوت اور شوق طلب و جستجو سے عبارت ہے۔ غالب کا فن خالص تخلیقی فن ہے شاعر کے فنی شاہکار بھی خیال و تصور کی دنیا میں تیار ہوتے ہیں جو فطری اصول کے تحت اس کائنات سے زیادہ حسین اور زیادہ مکمل بنائی گئی ہے۔ شاعرانہ فن بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ حسن و عشق کی بابت غالب کا نظریہ بہت بلند ہے۔ ہوس پرستی اور سوز عشق ان کی نگاہ میں جدا جدا دو جذبے ہیں۔ دراصل عشق و محبت غالب کی شاعری کا وسیع ترین باب ہے۔ جو شاعر کے فنی اور ادبی محاسن پر مشتمل ہے ایک باکمال فنکار جذبات و احساسات کے اظہار و بیان کیلئے بہت کم اصول اور ادب کی قدیم روایات کا خیال رکھتا ہے۔

اور غالبؔ جو کہ انقلابی شاعر ہیں اپنے الفاظ اور انکی نشست سے جو کام لینا چاہیں لے لیتے ہیں۔ وہ اپنے الفاظ کو ان کی رنگینی، رعنائی اور تنوع کے باعث طلسم سے تشبیہ دی ہے۔ غالبؔ کے الفاظ حسن کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ان کے انتخابات فنی کمال اور ادبی کمال میں عبور حاصل کر لیا ہے۔ ان کے الفاظ میں دلی جذبات کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فنی کمال سے اپنے تخیلی پیکروں کو الفاظ کے جامہ میں ملبوس کیا ہے۔ دراصل یہی فنکار کا کمال ہے۔ طرز ادا کے محاسن میں شاعرانہ مصوری بھی داخل ہے غالبؔ نے جو لفظی تصویریں بنائی ہیں وہ جاندار اور گویا ہیں۔ غالبؔ نے محاورات کا بہت کم استعمال کیا ہے جو دراصل بیجان پیکر ہیں۔ جو کثرت استعمال سے زمانہ سے روح کی تازگی اور معنی کی ندرت کھو چکے ہیں۔

شاعرانہ تصویر کشی دو طرح کی ہے ایک منظر کی عکاسی اور دوسرے جذبات کی ترجمانی۔ غالبؔ غزل گو شاعر ہونے کے ناطے مناظر کے مقابلہ میں اکثر جذبات کے چربے اتارے ہیں۔ جذبات کی تصویر کشی بہت دشوار ہے، دراصل تخیلی محاکات ہے جس میں محاکات اور تخیل دونوں شامل ہیں غزل کا یہ کمال ہے۔ اس میں جذبات کی بوقلمی ہوتی ہے۔ غالبؔ کی غزل گوئی ایک اور حیثیت سے بھی ممتاز ہے۔ محبت کے دو شعبے ہیں ایک کیفیات محبت دوسرے نفسیات محبت۔ میرؔ، مومنؔ دراصل کیفیات محبت کے ترجمان ہیں انہوں نے صرف یہی کیا ہے کہ محبت کی گوناگوں کیفیات کو شعر و غزل میں ادا کیا ہے۔ مگر غالبؔ دل و دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ وہ ان کیفیات کے علاوہ محبت کی نفسیات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ وہ دقیق سے دقیق جذبے اور کیفیت کی نفسی تحلیل کر سکتے ہیں۔ ان کے کلام کی چمک دمک اسی تحلیل اور تجزیہ کی رہین منت ہے ان کے اشعار میں تیر و نشتر ہیں جذبات کا حشر اور دنیائے دل کے ہنگامے ہیں۔ گویا ان کی شاعری تیر نیم کش ہے جو جگر کے پار نہ ہو سکا اور برابر خلش ہوتی رہتی ہے ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

علم کے حق میں غالبؔ خود بھی دریا دل تھے اور تجربات کا خزانہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ ہمیشہ جدید اور پاکیزہ تشبیہیں استعمال کرتے تھے۔ غالبؔ غزل گو ہونے کے علاوہ نثر نگار کی حیثیت سے اردو اور فارسی زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ مگر زمانہ حال میں لوگوں نے فارسی کے بجائے ان کے اردو کلام کو زیادہ عزت کی نظر سے دیکھا ہے خود غالبؔ اپنے فارسی کلام پر ناز کرتے تھے اور اردو شاعری کی کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ غالبؔ کے پورے کلام میں نشاط اور مستی ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، یہی نہیں بلکہ تصوف، فلسفہ، شوخی، طنز و ظرافت، یاس و حسرت ان کے کلام میں ہر جگہ موجود ہے۔ اکثر مشاعرہ میں غالبؔ ایسے دلکش اور موثر لہجے میں غزل پڑھتے کہ ساری محفل محو ہو جاتی۔ آواز بہت اونچی اور پردرد تھی۔ غزل خوانی میں ایک فریاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی ؎

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ثریا جان
بی اے اسپل دوم
(مدیرہ)

غالب کے خطوط میں جدت طرازی

مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب نظام جنگ دبیر الملک کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ غالب کیا ہیں اور کیوں آسمان شہرت پر درخشندہ آفتاب کی طرح جلوہ فگاں ہیں۔ خود انھیں بھی اپنی قدردانی اور وقعت کا پورا پورا تیقن تھا۔ مکمل وثوق تھا کہ اردو ادب میں ان کا مقام کیا ہے اس حقیقت سے ہر ایک ضرور واقف ہے، شاید اسی وثوق کی بنا پر وہ کہتے ہیں ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

غالب اردو ادب میں اپنی ایک الگ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مشہور و مقبول شاعر تھے۔ فارسی نثر نگاری پر بھی عبور حاصل تھا۔ اور اردو نثر نگاری میں چند تقریظے، دیباچے اور تین رسالے ہیں، زیادہ تر خطوط و رقعات ہی ان کی اردو نثر نگاری میں شامل ہیں۔ یادگارِ غالب میں حالی نے کہا ہے کہ "مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی"۔ یہ خیال کسی مخصوص آدمی کا نہیں ہے بلکہ ہر اردو داں اور قدرداں غالب کا ایمان کامل ہے کہ ان کے یہ خطوط ایک گراں بہا خزانہ ہیں۔ بہر حال ان کی شہرت کی وجہ وہی خطوط و رقعات ہیں جن کی اشاعت کا غالب کے قدرداں دوستوں نے اظہار خیال کیا تو غالب نے اسے اپنی حاصل کردہ شہرت کیلئے باعث ننگ سمجھا۔ چنانچہ جب غالب کے دوستوں نے مرزا سے ان خطوط کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کیا تو جواب میں منشی نرائن کو لکھتے ہیں:

"اردو رقعات جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے"۔

اور اس "تحریر سرسری" کی شگفتگی اور زبان کی شیرینی و چاشنی کبھی بھلائی نہ گئی۔

اپنے ایک اور عزیز دوست منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے،

لوگوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے" ان مشتاقانِ دید کی تشنگی کبھی بجھتی اگر ان کے شوقِ دیدار نے محبوب کو بے پردہ حجاب حائل کرنے پر مجبور نہ کیا ہوتا۔ قدر شناسوں نے ان مکتوبات کی قدر و قیمت کو جانا اور ان خطوط کے مجموعے کو چھپوایا تو زمانے نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان خطوط کو ادبی سرمایہ سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بالآخر خود غالب کو اس بات کا احساس ہونے لگا اور ان کے بیش بہا ہونے کا خود اعتراف کرنے میں چنانچہ لکھتے ہیں؛

"میں نے ایک ایسا اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"

غالباً اس زمانے میں اردو میں کچھ لکھنا حد یہ کہ خانگی خط و کتابت بھی علمی بے مائیگی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور اردو میں خطوط نگاری بھی بالکل متروک تھی۔ غالب کی جدت پسند طبیعت نے یہاں بھی اپنے لئے نئی راہ نکالی۔ یادگارِ غالب میں حالی کے خیال کے مطابق غالب جیسے فارسی داں کو ایسے دور میں اردو زبان میں خطوط نویسی پر جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ شاید تصنیف مہر نیم روز کی مصروفیت کا تقاضہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک مشتاق عاشق کو جیسے اپنی چہیتی محبوبہ کا دیدار نصیب ہوا۔ برسوں کے تشنہ کام لبوں کی جیسے پیاس بجھ گئی۔ لوگوں نے جب غالب کا کرشمہ ان خطوط کی صورت میں دیکھا تو اپنی عقیدتمندی کے پھول انکی مزید اشاعت کے اشتیاق کی صورت میں نچھاور کئے۔ اور ان خطوط کو ادبی سرمایہ سمجھ کر بڑی حفاظت سے اپنے پاس محفوظ رکھا۔ آسمانِ علم پر جب یہ تابندہ ستارہ ابھرا تو لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

بہرحال ان خطوط کی دلکش خصوصیات نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت تو انھیں کے لفظوں میں یہ ہے کہ انہوں نے "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے" انہوں نے اپنے خطوط میں پرانے طرز کے آدابِ القاب اور طویل مزاج پرسی و خیریت گفتاری کو بالکل ترک کر دیا اور اگر القاب کا کہیں استعمال کرتے بھی تو ایک انوکھے انداز میں۔ اس فرسودہ رواج کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ خط کا آغاز کبھی برخوردار کبھی میاں کبھی پیر و مرشد یا مہاراج سے کرتے ہیں۔ ان کے خطوط کے القاب پیر و مرشد، برخوردار، فرزندِ ارجمند، نورِ چشمی، جانِ غالب، راحتِ جاں — کبھی کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور پہلی سطر سے ہی مضمون کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اس انداز سے بے ساختہ خط کا آغاز کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا دم بخود ہو جاتا ہے۔ جیسے:

"مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے"

"اجی حضرت آپکو کیا چاہیئے"

خطوط کے اختتام پہ بڑی عاجزی سے لکھتے غالب خاکسار، غالب جواب کا طالب، غالب دیدار کا طالب یا حقیر و فقیر غالب وغیرہ۔

اپنے خطوط نگاری کے بارے میں انکا کیا خیال ہے یہ ان کے تحریر کردہ ایک خط سے آپ بھی اندازہ لگائیے لکھتے ہیں؛

"پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنا ہے اسی لئے میں القاب و آداب نہیں لکھتا"۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کر رہے ہوں، مثلاً ان کو

لکھا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کو ٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے اس مطلب کو انہوں نے اسطرح ادا کیا "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی۔ تیاریاں ہو رہی ہیں"۔

غالب کے خطوط کو ناولوں اور ڈراموں سے زیادہ دلچسپ و پر لطف بنانے میں انکی طبعی ظرافت کو بہت بڑا دخل ہے۔ ظرافت نگاری تو آجکل ایک مستقل فن بنتی جارہی ہے جو حقیقت میں ذہنی اختراع ہے۔ مگر غالب کی مزاح نگاری اصلی اور فطری تھی۔ ان کی شوخی اور ظرافت طبع زاد ہونیکی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے اور پڑھنے والا انکی لطافتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جب وہ کسی سے مذاق کرتے تو مخاطب کے مذاق اور مرتبہ کا ضرور خیال رکھتے اور مکتوب الیہ کو کوئی نہ کوئی خوش کرنیوالی بات ضرور لکھتے جس کی بے ساختگی اور شگفتگی سے وہ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے ایک دوست کی لڑکی بچپن میں ان سے بے پردہ تھی مگر اب جوان ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے دوست کو لکھا تو ان کی دختر کو لکھتے ہیں:۔

"کیوں بھئی! اگر ہم کول آبھی گئے تو تم سے کسطرح ملیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

انداز ظرافت کے پردہ میں انکی تلخ گوئی بھی چھپ جاتی تھی۔ ظرافت کے اس پیرایہ میں سوال کی خفت اور بدنمائی کو بڑے سلیقہ اور خوش نمائی سے چھپا لیتے ہیں۔ مکتوب الیہ یعنی خصوصاً وہ شخص جو انکی تلخ گوئی کا صید ہوتا ہے وہ بھی ان کی حلاوتوں اور پرکاریوں کو دیکھکر سر دھننے لگتا۔ انہوں نے اپنی ظرافت کو ہمیشہ ایک ہی رنگ میں نہیں رہنے دیا بلکہ ہر وقت ایک نئے قسم کا مذاق کرتے۔ ان کے خطوط میں وہی گھسی پٹی باتیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ بلکہ اس ظرافت کی حلاوتیں اس کے ذہن میں رس گھول دیتیں۔ ہر لمحہ نو بہ نو نیا نیا مذاق۔ شوخی نت نئے ڈھنگ کی۔ چنانچہ جب ۱۸۵۷ء میں دلی میں غدر ہوا تو دلی کا ہر گھر بربادی و تاراجی کا شکار بنا ہوا تھا۔ کوئی گھر اس ناگہانی آفت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ چنانچہ غالب غریب بھی انہیں میں سے ایک تھے۔ انہیں سب مال واسباب اور ساز و سامان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ نوبت یہانتک آپہنچی کہ روٹی کیلئے کپڑے تک بیچنے پڑے۔ ظاہر ہے ایسی خلاکت زدہ حالت میں کون ایسا حوصلہ مند ہوگا جو اس قسم کے حالات میں بھی اپنی شوخی کو نہ چھوڑا ہو۔ لکھتے ہیں۔

"اور لوگ تو روٹی کھاتے ہیں مگر میں کپڑے کھاتا ہوں"

خود اپنی مصیبت کی حالت میں بھی جب اس ظرافت نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا تو دوسرے مواقع پر کیا حال ہوتا ہوگا۔ بات کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن ان کی ظرافت طبع ضرور اپنی جھلک دکھا دیتی ہے۔ یہ طبعی ظرافت اور شوخی وہاں بھی ان سے نہیں چھوٹتی جہاں ایک غالب جیسے حساس طبع انسان کو ہر حالت میں سنجیدہ ہو جانا چاہیئے چنانچہ اپنے ایک دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چناجان کی تعزیت میں لکھا ہے۔

"مرزا حاتم ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔

ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو سو میرا اس نصیحت پر عمل ہو رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی' آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی مناجان سہی" وغیرہ وغیرہ۔ اپنے غم خوار و دل شکستہ دوستوں کی دل جوئی و دلآسائی کرتے بھی تو ظرافت اپنا پورا رنگ جمائے رہتی۔ ان کے تعزیتی خطوط میں بھی یہ رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا موت ان کیلئے کھیل تماشہ ہو۔ اس بات کے شاہد ان کے حاتم کو تحریر کردہ اور دوسرے کئی خطوط ہیں جن سے ان کی طبیعت کا چلبلاپن اپنی پوری رعنائیوں کیساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ جب کسی سے شکوہ یا شکایات کرتے بھی تو شوخی اور ظرافت ہی کی آڑ لیتے جو انکی عادت طبعی ہے۔ جب ہرگوپال تفتہ نے بہت دنوں کے بعد بھی خط کا جواب نہ دیا تو لکھتے ہیں؛

"کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں، بھلا ایسا حکم ہوا بھی ہوتا تو یہاں بھی یہی اشتہار ہوتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک سے نہ جائے۔"

ایک اور خط میں دیکھئے کہ صرف دو چار دن کے ہیر پھیر میں کیسا نکتہ پیدا کیا ہے اور کسطرح اس میں بھی ایک مذاق پہلو اجاگر کیا ہے۔ ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھا تو غالب کی شوخ طبیعت نے یہاں بھی اپنی شوخی کا ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ کہتے ہیں: "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"۔

غالب نے اپنی طبیعت کی افتاد سے یہاں تک جدت کا اختراع کیا ہے کہ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اسے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں؛ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میر مہدی آیا! جیتے رہو آفریں، صد ہزار آفریں اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

اس عبارت میں ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں لیکن جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف تھے ان کو غلط فہمی ہو گئی کہ مرزا حالی پانی پتی کی نسبت لکھ رہے ہیں۔ ایسے بہت سے خطوط نظر آجاتے ہیں۔

غالب کے تھوڑے خطوط ایسے بھی ہیں جو مقفیٰ ہیں اس سے مقصود اس دور کے رنگ کی پیروی نہیں بلکہ یہ بھی ایک قسم کی دل لگی یا چہل تھی۔

ان کے خطوط میں تعلقات خانہ داری کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں' اپنی بیوی کے بارے میں انکے خیالات

اوران دونوں کے آپس کے تعلقات اور سلوک وغیرہ کا ان خطوط سے اظہار ہوجاتا ہے لیکن حالی صاحب کا خیال ہے کہ وہ محض انکی ظرافت کی گلکاریاں تھیں۔ جب انکی شرارت پھڑک اٹھتی تو اپنی بیوی کے بارے میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی خطوں میں اس قسم کی تحریر پائی جاتی ہے "عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے بھیجا گیا (پیدا کیا گیا) تیرہ برس حوالات میں رہا ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (نکاح) صادر ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی"۔ یہ بیڑی ان کی محترمہ اہلیہ امراؤ بیگم تھیں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے"۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ یہ صرف شوخی تھی ویسے انھیں اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اور ان کے تعلقات بہت اچھے تھے جب کبھی یہ غریب الوطن ہوتے تو اپنی بیوی کو باقاعدہ پابندی کیساتھ خط لکھا کرتے تھے۔

غالب کا مشاہدہ بہت زبردست تھا اور اپنے اس مشاہدہ کو بیان کرنے کیلئے وہ موزوں اور موثر الفاظ کا انتخاب بھی خوب کرتے۔ مختصر عبارت' بیان کی شیرینی' سادگی اور پرکاری وغیرہ ان کی نثر کی خاص خصوصیات ہیں۔ برائے مناسب اور موثر الفاظ میں اپنے اطراف ماحول یا کسی منظر کی منظر کشی کر دیتے۔ مختصر سی عبارت میں ساری ضروری باتیں آجانا وہ بھی اسطرح کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے اس بیان کردہ واقعہ یا منظر کا نقشہ پھر جائے کسی معمولی آدمی کا ادنیٰ سا کارنامہ نہیں بلکہ غالب جیسے اہل کمال کی کاوش عظیم ہے۔

غالب کے کلام سے زیادہ انکے خطوط انکے آئینہ دار ہیں۔ ان کے عادات واطوار طرز گفتار اخلاق وکردار انکی طرز زندگی رہن سہن سب ان کے خطوط سے عیاں ہوجاتے ہیں' ہمیں ان کے خطوط میں وہ سب باتیں ملیں گی جو ان کی فطرت میں رچی بسی ہیں۔ ان کے خطوط ان کی دل آویز شخصیت کے غماز ہیں۔ ہم ان کے کلام سے ان کے وسعت قلب کی گہرائیوں میں اسطرح نہیں پہنچ سکتے جسطرح ان کے خطوط سے۔ غالب ظاہری کے ساتھ ساتھ غالب باطن تک پہنچنے کیلئے ان کے خطوط تاریک راستے میں مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے وسعت قلب' رواداری' انسان دوستی' مروت وبھائی چارہ' محبت' انکی عالی ہمتی' زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ اور سب سے بڑھ کر ان کا مخصوص حزن۔ یہ سب چیزیں ان خطوط میں ہی انتہائی دل آویزی کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ انکا تحریر کردہ ایک خط ہے اسے آپ بھی پڑھیئے۔ اس سے ان کے فطری جذبہ ہمدردی کا پتہ بھی لگ جاتا ہے اور خود ان کی مصیبت کا حال بھی ہم پر ظاہر ہوجاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو دوسروں کو بھیک مانگتے نہیں دیکھ سکتا اور جو خود بھیک مانگتا ہو وہ میں ہوں"۔

ایک چھوٹی سی سطر میں اپنی فطری ہمدردی کا احساس بھی دلا دیا اور تنگدستی کا نقشہ بھی کھینچ دیا۔ ظاہر ہے ہم جو ان گنت صفحے سیاہ کرنے کے بعد کہیں جاکر اپنی حالت کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور دوسروں کی ہمدردی ونظر التفات کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے وہ غالب نے سادہ الفاظ میں مگر موثر انداز میں بیان کردیا ہے جیسے کوزہ میں دریا بھر دیا گیا ہو۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اور لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑے کھاتا ہوں"۔

اس سے غدر کے ہنگامہ کا شکار ہوکر انکی حالت کہاں تک پہنچ گئی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔

واقعہ نگاری یا منظر نگاری پر انہیں کس قدر عبور حاصل تھا ہمیں اندازہ لگانے کے لئے ایسے بہترے خطوط مل جائینگے جو ان کی اس خصوصیت کے شاہد ہیں ایکدن شدت بارش کی وجہ سے ان کے گھر کی جو حالت ہوئی تھی وہ میں تو بیان نہیں کر سکتی انہیں کے الفاظ سے معلوم کیجئے، لکھتے ہیں:

"میں موت سے نہیں ڈرتا بلکہ فقدان راحت سے ڈرتا ہوں۔ یہ گھر محلسرا سے بھی بدتر ہے بارش دو گھنٹے برستی ہے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"۔

دیکھئے موت سے زیادہ انھیں زندگی میں فقدانِ راحت کی فکر لاحق ہے۔ ان کی بیماری اور علالت کا حال بھی جانئے، کسقدر صحیح نقشہ پیش کیا ہے کہتے ہیں:

"ناتوانی اور کمزوری بڑھ رہی ہے، رکاب میں پاؤں ہے، باگ ہاتھ پر ہے، دور دراز کا سفر ہے اور زادِ راہ کچھ نہیں"۔

ایک تو ہمیں ان کی پسماندہ جسمانی قوت کا اندازہ ہوگیا اور دوسرا ان کی قریب المرگی بھی عیاں ہے اور چل چلاؤ کے دن بھی ختم ہو گئے جیسے ہی انہوں نے ہانک لگائی (یعنی جسم سے روح کا بوجھ اٹھایا نہ گیا) یہ اسپ روح سرپٹ دوڑ جائے گا۔ لیکن اس بات کا بھی انہیں اعتراف ہے کہ زادِ راہ کچھ نہیں۔ لڑکپن تو سیاہیانہ کھیلوں میں گذر گیا ہوگا اور جوانی نے دیوانہ و بدمست بنا دیا تو عیش و نشاط کو اپنا متاعِ حیات سمجھ لیا اور جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو شعر و شاعری اور شراب و کباب کے عمیق دریا میں غرق ہو گئے۔ تو بھلا انہیں زادِ راہ کی تیاری کی مہلت کیا ملتی ویسے ان کا اپنا خیال ہے کہ اگر شراب کی زلف گرہ گیر میں اسیر نہ ہوتے تو ضرور صوفی ہوتے اس ہوشربا نے تو ان کی ریاضت و عبادت کو ملیامیٹ کر دیا اسی لئے تو کہتے ہیں کہ

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ ولی ہوں یا نہ ہوں لیکن ترقی یافتہ حیوان کے علاوہ ہنسنے ہنسانے والا حیوان ضرور تھے۔ اور انہیں اس قسم کا حیوان بنانے میں ان کی طبعی ظرافت و شوخی ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ باتوں کو بھی اسی ظرافت کے حسین پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔ بات کتنی ہی شوخی سے کیوں نہ کہی گئی ہو لیکن اسکی اہمیت و قدر کو دھکا نہیں لگتا بلکہ اسی انداز میں اسکی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ان نکات کا فلسفیانہ رنگ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اپنے ایک دوست کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت نامہ لکھتے ہیں، اس میں تحریر ہے کہ ــــ "مرنے کا وہ غم کرے، جو آپ نہ مرے"۔

اس ایک سطر میں کیسا فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ موت ناگزیر ہے جب مرنا ہی ہے اور خود ہم بھی ایک دن موت کا شکار ہونے والے ہیں تو دوسروں کی موت کا رنج بالکل بے معنی ہے پھر لکھتے ہیں کہ اس قید سے جو چھٹکارہ ہوا وہ تو خوش بختی تھی اور اگر ایسے ہی انھیں اس گرفتاری میں رہنا پسند تھا تو "چنا جان نہ سہی منا جان سہی" بھلا ایک ہی چیز پر جان دینے

سے کونسا افادی پہلو نظر آتا ہے جبکہ دنیا ایسی اور اس سے بھی بالاتر چیزیں دنیا میں موجود ہیں۔ زندگی اتنی سستی نہیں کہ ایک کے پیچھے ہی لگائی جائے اس میں اتنی وسعت ہے کہ کل کائنات اس میں سمائی جا سکتی ہے۔ غرض ان کی نثر میں خصوصاً ان کے مکتوبات میں ظرافت کا عنصر بہت زیادہ غالب ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے ان کے خطوط کو سب سے دلچسپ و دلکش بنادیا اور یہی دلکشی لوگوں کی ان کے پڑھنے اور محظوظ ہونے کا باعث بنی۔

مرزا کے اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ بقول حالی "نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ نکالا اور نہ ان کے بعد ہی کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔" لیکن اتنا ضرور ہوا کہ فرسودہ آداب و القاب کا طریقہ اور ایک طویل مزاج پرسی کی جگہ سادگی نے لے لی۔

ان کی جدت طرازی نے انہیں بلند مقام عطا کر دیا۔ ان کی نثر بہت سی فنی اور لسانی خوبیوں کی حامل ہے۔ سادہ بیانی، سلاست و روانی، انداز گفتگو، خوش کلامی اس حد تک ان خطوط میں نمایاں ہیں کہ پڑھنے والا بے خود ہو جاتا ہے۔ نہایت درجہ پیارا انداز بیان، سادگی و پرکاری، شوخی و ظرافت، تشبیہات و استعارات، پراثر اور موزوں الفاظ نے نثر غالب کے لئے ایک درجہ متعین کر دیا۔ زبان و بیان کی حلاوتوں میں پڑھنے والا کھو سا جاتا ہے۔ ظرافت کی رنگینی و شیرینی تمام تحریروں پر غالب آجاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ہندستانی فارسی نثر نگاروں کو ہیچ و پوچ جاننے کے باوجود غالباً انہوں نے کم و بیش اسی رنگ کی پیروی کی ہے جو فارسی کا اصلی رنگ نہیں تھا۔ تصنع، بناوٹ، تکلفات کی بھرمار ہوتی تھی۔ یہی تصنع اور بناوٹ، تکلف اور الفاظ کا گورکھ دھندا غالب کی فارسی نثر میں بھی ملتا ہے لیکن انکی اردو نثر میں یہ ساری باتیں یکسر مفقود ہیں۔ اردو میں انہوں نے سیدھا سادا فطری اور اصلی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان رقعات و خطوط میں شگفتگی چونکا دینے والا بانکپن اور بے تکلفی جیسی جاذب کن خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اگر انہیں اپنی اس نثر نگاری پر کمال ناز تھا تو بجا تھا۔

یہ اپنی اس طرز نو کے بانی اور خاتم بھی ہیں کیونکہ ان کی رہنمائی کے بعد بھی کوئی اس راستہ کو اس کامیابی و کامرانی کے ساتھ طے نہ کر سکا جس طرح خود غالب نے طے کیا تھا۔ یہی اس میدان کے واحد و یکتا کھلاڑی ہیں۔ ان کی ان نثری خوبیوں کے مدنظر کون ہے جو اس بات پر متفق نہ ہو کہ غالب مملکت نثر کے واحد تاجدار ہیں۔ اگر انہیں ایسا کمال حاصل نہ ہوتا تو آج ان پر اتنی کتابیں نہ لکھی جاتیں۔ یوم غالب نہ منایا جاتا۔ ڈاک ٹکٹ پر ان کی تصویر نہ آتی۔ بہت کچھ انپر انکی شخصیت پر ان کے کلام و نثر نگاری پر لکھا جاچکا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی بہت کچھ باقی ہے جو کچھ ان کی وقعت اور قدر دانی کی گئی ہے وہ بھی کم ہے۔

ایسا اچھوتا اور نرالا ڈھنگ بھلا کہاں ڈھونڈنے سے ملتا ہے۔ اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر نگاری پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ اور انکی جدت طبعی کا احسان ہے۔

کتنی مثالیں دیں کہاں تک گنائیں کونسا وہ خط ہے جس میں انکی حلاوتوں نے رس نہ گھولا ہو۔ کونسا وہ خط ہے جس میں انکی شوخی و ظرافت کی حسن کاریاں نہیں ہیں۔ کونسا انسانی پہلو ہے جو ان خطوں سے چھوٹ گیا ہے اشعار کی اصلاح و تشریح، پند و نصیحت، فلسفیانہ نکات سب کچھ ملیں۔ اس میں بھی انکا اور ان کے دوستوں کا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک انسان کا اور ایک ملک کا

نزدیک اور روشن پہلو دونوں نظر آجاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہماری توقعہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ ان کے اوراقِ حیات ہمارے سامنے کھلے پڑے ہیں جس جو چاہے حاصل کیجیے، کوئی روک ٹوک نہیں۔

منجملہ ان کی نثر کے بیان کردہ خصوصیات کے پیشِ نظر ہمیں کوئی اور ایسا بیش بہا خزانہ نہیں مل سکتا۔ یہ غالب ہی کا حصّہ تھا جو شاید انھیں تک ختم ہو گیا۔ کچھ تھوڑی بہت تقلید تو ہوگئی لیکن اس کو اپنی مٹھی میں کر لینا کس کے بس کی بات ہے یہ تو بس پڑھنے والے کی استعداد ذہنی اور مذاق طبع پر منحصر ہے۔ آپ ہی سوچئے کیا وہ ایسے موتی یا بیش قیمتی ہیرے نہیں ہیں جو پتھروں کے درمیان سے چن لئے جائیں۔ بہر حال یہ اپنی اس ایجاد کردہ تحریر کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جب تک کائنات ہوگی کائنات کا ایک ذرہ بھی ہوگا اسوقت تک ان کا نام رہے گا۔ جب قیامت ہوگی تو سب کچھ فنا ہو جائیگا لیکن اگر کسی چیز کے باقی رہنے کی گنجائش ہے تو وہ صرف غالب کا نام و نشان ہوگا۔ ذہنوں سے کبھی نہ فنا ہونے والا ' ایک ان مٹ اور لافانی نقش " غالب "۔

▲ ———

" نذرِ غالب "!

جناب سید مرتضیٰ باشاہ قادری شمشیر میسور

ہوئے آزاد ہم غالب ملا کیا — گرانی خاقہ مستی کے سوا کیا
وہی ہے ملک میں جبر و تشدد — ابھی ہے ظلم کی کچھ انتہا کیا
کہا تھا بے وفا اس فتنہ گر کو — حقیقت تھی تو پھر میری خطا کیا
جب آئے سر پہ مرگِ ناگہانی — دوا کی کیا حقیقت ہے دعا کیا
ملی ہے مجھکو تنخواہ ہاں ملی ہے — چکایا قرض تو آخر بچا کیا
جسے جینے کے لالے پڑ رہے ہیں — درازی عمر کی مانگے بھلا کیا
لکھا ہے میں نے خط بیشک لکھا ہے — یہ مجھب کر دیکھنے کی ہے ادا کیا
لباس مغربی تم کو مبارک — ہے عریاں جسم تو آخر برا کیا!
تلاش ہے اک کرائے کے مکاں کی — ہے زحمت اس سے بڑھکر اے خدا کیا
ہو کافی دودھ، غلہ، تیل یا گھی — نہ ہو جب تک ملاوٹ وہ غذا کیا
چلے ہیں جشنِ صد سالہ منانے — ادا غالب کا حق ہم سے ہوا کیا

وبا جوڑے کے پیسوں کی ہے شمشیر
ہیں بی، اے پاس تو شرم و حیا کیا

م ۔ ن ۔ سعید ، ایم ۔ اے (سال دوم)
میسور یونیورسٹی ۔

غالب کی تعزیت نگاری

نثر میں تعزیت نگاری ایک مخصوص صنفِ ادب کی حیثیت سے مروج نہیں ۔ دراصل تعزیت میں ذاتی انس اور لگاؤ کا عنصر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کسی کے شدتِ غم کو اتنی ہی سچائی کیساتھ اور لوگ محسوس نہیں کر سکتے ۔ تعزیت نگار اور جس کی تعزیت کی جائے دونوں کا رشتہ بہت گہرا اور شدید ہو سکتا ہے مگر کائنات کے پس منظر میں بہت تنگ ہوتا ہے ۔ یہی امر تعزیت نگاری کو ادب بننے سے روکتا ہے کیونکہ وہ ادب نہیں جس میں بہت سے لوگ ذہنی طور پر شریک نہ ہوں ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے انسان کی تعزیت میں ایک عالم شریک ہو یعنی کائنات کے پس منظر میں اس انسان کا رشتہ ضرور وسیع تھا لیکن اس وسعت میں گہرائی کا کوئی عنصر نہ ہوگا ۔ دراصل تعزیت وہی سچی ہے جس میں دو شخصیتیں اپنے خیالات افعال اور ذہنی معیار میں زیادہ تر ہم آہنگ رہی ہوں اور ان میں سے ایک کے گم ہو جانے پر دوسری نقصانِ شدید کا احساس اور اظہار کرے ۔

ان تشریحات سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقی تعزیت ذاتی ذہنی نقصان کا اظہار ہے ۔ یعنی تعزیت بہر حال "ذات" کے تنگ حدود میں مقید ہے ۔ اب کوئی نقصان کے اس احساس کو اتنی بلندی عطا کر دے کہ دوسرے بھی اس میں ذہنی طور پر شریک ہو جائیں تو یہ فقط عالی ظرف فنکار سے ممکن ہوگا ۔ اور اس کی تعزیت نگاری ضرور ادب ہوگی ۔ اور غالب کے تعزیتی خطوط پڑھ کے جی چاہتا ہے کہ انہیں ضرور ادب کہیے ۔

ان کے تعزیتی خطوط کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور تمام خطوط کے مقابلے میں تو قریب قریب نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کے تعزیتی خطوط ان مشہور خطوط میں سے ہیں جو غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو یاد ہو چکے ہیں ۔ ان خطوط میں موت اور غم کا کوئی بسیط فلسفہ نہیں ملتا ۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے وہ فلسفیانہ موشگافیوں پر ہمدردی کو ترجیح دیتے ہیں ، لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کی فکر زلیست کے اس اہم پہلو کو چھوئے بغیر نکل جائے ۔ اس کے باوجود اس تذکرے کی حیثیت اس جھاگ کی سی ہے جو بہر حال ہمدردی کے وسیع سمندر کی سطح پر ہو ۔

غالب کا اپنا کوئی رشتہ دار ایسا نہیں تھا جس کو انہوں نے تعزیتی خطوط لکھے ہوں، جتنے لکھے دوستوں کو لکھے، لیکن ان خطوط کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خطوط غیر کسی گہرے رشتہ کے لکھے جا سکتے ہیں۔ دراصل قدیم شعراء میں ذہنی اور عملی طور پر کائنات سے یہ رشتہ جس نے سب سے زیادہ استوار رکھا وہ صرف غالب ہیں۔ اس کائنات کا کوئی فرد کوئی ذرہ ان کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اور ان سب کے بر مظہر سے ان کا رشتہ گہرا تھا۔ غالب نے کائنات کی "انسانیت" کو ہمیشہ اپنا سرمایہ اور اپنا اثاثہ سمجھا۔ اس لئے اس سے اپنی محبت کی اس نے اس کی جزوی فنا بھی انہیں غمگین بنا دیتی تھی۔

مزید اظہار خیال سے پہلے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ان کی تعزیت نگاری کے چند نمونے پیش کروں۔ والئی لوہارو کو ایک خط میں لکھا ہے:

"آج تک سوچا کیا کہ بیگم صاحبہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے جو غم تم کو ہوا ہو ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ بس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت میں کیا اور میری دعا کیا۔ مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور میری محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے"

یوسف مرزا کو بھی باپ کی وفات پر لکھا ہے۔

"کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یونہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا۔ اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے کوئی اگر پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو"۔

فرماں روائے رام پور کو لکھا ہے۔

"کل اس نے از موئے خط آلدہ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی، کیا کہوں کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کے اور مغموم ہوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بطریق انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں"۔

ان خطوط سے غالب کے دل کا خلوص ظاہر ہے۔ تعزیت جس حرمت اظہار کی طالب ہے اس میں انشا پردازی کی آلودگی انہیں پسند نہیں خواہ یہ تعزیت رام پور کے حکمراں سے کی جا رہی ہو۔ اور ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے آداب درباران سے متقاضی ہوں کہ وہ بے پناہ (مگر مصنوعی) غمگینی اور ہمدردی کا اظہار کریں۔ والئی لوہارو کے خط میں بھی ان کے خلوص کی صاف گوئی جھلکتی ہے۔ "بھائی! اظہار غم تکلف محض ہے جو غم تم کو ہوا ہو ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو"۔ اس صاف گوئی کے باوجود ہم اس احساس کو پالیتے ہیں کہ غالب بہت سے "انہوں" سے زیادہ ان احباب کے دکھ میں شریک ہیں۔

غالب کی درد مندی اور غم خواری ان کی زندگی کا ایک تابناک پہلو ہے۔ یوسف مرزا کے نام انہوں نے جو خط لکھا ہے

اس کی موجودگی میں ہمیں غالب کی شخصیت کے اس پہلو کو روشن تر دیکھنے کے لئے اور مثالوں کی ضرورت نہیں رہ جاتی ۔ صبر کی تلقین ان کے نزدیک بے دردی ہے اور یہ ابنائے روزگار کا ایک شیوۂ فرسودہ ہے ۔ اس خط میں ان کے جذبات ہمدردی اور ان کی تڑپ اتنی شدت سے ابھر آتی ہے جیسے باپ یوسف مرزا کا نہیں غالب کا مرا ۔ یوسف مرزا کا نقصان یوسف مرزا سے زیادہ غالب کا نقصان ہے ۔ اور ان کی ہمدردی اتنی نازک حدود کو چھونے لگی ہے کہ وہ ہمدردی کے طالب نظر آنے لگے ہیں ۔ ان کی زندگی غموں میں گذری تھی وہ غم کی شدت اور اس کی کاٹ کو پہچانتے تھے ۔ اس لئے دوسروں کے غموں کو اپنانا، بانٹ لینا اور ہمدردی کرنا ان کو آتا تھا ۔ ایک خط میں لکھا ہے " میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل تو اپنے اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پہ یہ حادثہ پڑا ہوتا تو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا تو کیا کرتا ؟ "

دوسرے کے غموں کا بڑا حصہ کون یوں سمیٹتا ہے ؟

ان کے جذبات کی سچائی انہیں لمبے چوڑے نامے لکھنے سے روکتی ہے ان کا شدت احساس حشو و زوائد کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ ان کے تعزیتی خطوط یا خطوط کے تعزیتی بے حد مختصر ہیں ۔

لیکن غالب کی تعزیت نگاری میں یک رنگی نہیں ہے ۔ یہ لفظ ان کی لغت میں ملتا ہی نہیں ۔ ان کے تعزیتی خطوط میں ہمیشہ دردمندی نہیں ملتی ۔ تمسخر اور ہلکی ہلکی چوٹیں بھی ملتی ہیں ۔ لطیف مزاح بھی ملتا ہے ۔ اس سے ان کی ظرافت کے دو پہلو واضح ہوتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ موت سے بڑا کوئی غم نہیں اور اس حالت میں ہنسی مذاق بے وقت کی راگنی ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے خطوط کا کمال یہ ہے کہ وہ ناگواری کا احساس دیئے بغیر فسردہ لبوں کو کھلا دیتے ہیں ۔ اس سے ان کی ظرافت کی اس لطافت اور بلندی کا ثبوت ملتا ہے جو اس پل صراط سے صحیح و سلامت گذر جاتی ہے ۔ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ وہ دوسرے کے غم کو کتنی شدت سے محسوس کرتے تھے ۔ اب غم گینی کے اس کرب سے گذرنے کے بعد اس پر بہادری سے مسکرا دینا اسے ٹھیک " رواقیت " بھی نہیں کہہ سکتے ۔ یہ ایک طرح کی خدائی ہے جو دکھوں کی اذیت کے کڑے تجربے کے باوجود ان سے بلند ہو کر بے نیازی سے ہاتھ ہلا کر رد کر دینے کو اپنا شعار بنا لیتی ہے ۔ اور غالب کی یہ خدائی دوسروں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ اس پر صدق دل سے ایمان لے آئیں ۔

اس سلسلے میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھے ہوئے دو خطوط پیش نظر ہیں ۔ مہر نے اپنی محبوبہ " چنا جان " کی موت کی اطلاع دی ہے ۔ ان کی محبوبہ کے نام سے ہم ان کی محبت کے سماجی معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ غالب بھی یوسف مرزا کے باپ اور چنا جان کے فرق کو نظر انداز نہیں کرتے ۔ لکھتے ہیں ۔

" اس کی اطاعت اور اس سے تمہاری محبت ، سخت ملال ہوا ۔ رنج کمال ہوا ۔ سنو صاحب ! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؓ اور عشاق میں مجنوں ۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں ۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؓ سے ٹکر کھائے ۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو ۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری ۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں مری اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری ۔ "

اس مقام پر انہیں اپنی محبت کی یاد آئی ۔ لکھتے ہیں ؛

"یہ مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ بانکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ کیا گذرتی ہوگی صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو۔"

کتنی سادگی سے مہر کے غم میں شریک ہو گئے۔ ابتدائی شوخ بیانی کے بعد آخری جملوں میں ان کے غم کو سمجھنے کا کتنا مؤثر اظہار ہے۔ اس کے بعد مہر نے ماتم پرسی کی تمنا کی ہوگی جس پر ہمدردی کے ساتھ ساتھ ان کی حسِ مزاح کھل کر ظاہر ہو گئی ہے۔

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں .... کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی مناجان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور۔ وہی اک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔"

لیکن ان کی اس "رواقیت" یا "خدائی" کا سب سے بہترین اظہار عارف کی موت پر لکھے ہوئے مرثیے سے ہوتا ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

بہرحال غالب کے تعزیتی خطوط عظمت انسانی کے اظہار کی ایک اچھی مثال ہیں، بقول اکرام "جس بارگاہ میں غالب کی شخصیت جلوہ گر ہے وہاں گردنیں تعظیم و احترام کے زور سے جھک جاتی ہیں اور مرزا کے عظیم الشان کارناموں اور ادبی ارتقا پر تحسین و آفرین کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن آپ اس بارگاہ سے صرف عقیدت و احترام کے خیالات ہی لے کر نہ جائیں گے بلکہ محبت، دوستی اور یار باشی کے جذبات سے متاثر ہوں گے۔"

"میر کی دنیا محدود قسم کی ہے جس میں اتھاہ گہرائی ہے۔ لیکن وسعت کچھ زیادہ نہیں۔ یہی وسعت غالب کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے۔ غالب کا حلقۂ دامِ خیال بہت وسیع ہے۔"

کلیم الدین احمد۔

سیدہ امۃ البصیر بی ایس سی (سال دوم)
نائب مدیرہ۔

قلمدانِ غالب

یہ فرمانِ سلطان عصر سراج الدین بہادر شاہ ظفر جب غالب نے چار جولائی ۱۸۵۰ء کو تاریخ خاندان تیموری کی قلمبندی کا آغاز کیا اور جنوری ۱۸۵۱ء تک امیر تیمور سے لیکر شاہ ظہیر الدین بابر تک کی تاریخ مکمل کردی اور مارچ ۱۸۵۱ء تک ہمایون کی جلاوطنی اور واپسی تک کی واقعہ نگاری کی لفظی نقشہ کشی کر چکے تو شاہ کا دوسرا فرمان صادر ہوا کہ از سر نو دنیا کی تاریخ تخلیق آدم و حوا سے لیکر شاہ وقت تک لکھی جائے۔ اس بلند ترین کام کو فلک بوس منزلِ عروج تک پہنچانے کی نیت سے تاریخ نگار کی امداد اور مشورے کی خاطر احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کو غالب کا مددگار مقرر کیا۔ فرمانِ شاہی کے اعلان تک تاریخ کی واقعہ نگاری مرزا نے فارسی میں کی تھی۔ فرمانِ نو کے بعد موصوف نے اظہار عقیدت کیا کہ واقعات کی اردو نگاری حکیم صاحب کے سپرد کر دی جائے اور اردو مسودہ اپنے پاس روانہ کیا جائے تاکہ فارسی میں اس کی ترجمانی ہو سکے۔ اب حکیم صاحب نے "تخلیق آدم و حوا سے لیکر چنگیز خاں تک کے واقعات تک مسودہ تیار کیا جس کی آب و ہوا میں تغیر اتنا آگیا کہ تاریخ کی موجودہ شکل اب وہ نہ رہی جس کو غالب نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اس لئے اس مسودہ کو دو پاروں میں تقسیم کر کے اس کتاب کا عنوان "پرتوستان" قرار دیا۔ پہلے پارے کا نام "مہر نیمروز" رکھا اور دوسرے حصہ کا نام "ماہِ نیم ماہ" طے کیا۔

اس منزل پر معاملے کی پیچیدگی یہ رہی کہ جب پہلے حصہ میں "آغاز روزگار" سے لیکر ہمایون تک کے واقعات لکھ دیے گئے اور دوسرے حصے میں شاہ اکبر سے لیکر بہادر شاہ تک کے حالات پورے کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کے دل کی دھڑکن ہمایوں کی بادشاہی کی منزلِ عروج پر پہنچکر یکایک ٹھہر گئی۔ اسلئے کہ نہ تو حکیم نے اردو مسودہ روانہ کیا اور نہ مترجم نے اسکو فارسی لباس میں سجا سکا۔ غالباً یہ الجھن ۱۸۵۴ء تک جاری رہی۔ من بعد ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر نے بحسن ملاحظہ اسکی نقل طلب فرمائی تو مارچ ۱۸۵۲ء میں ارسطو کی خدمت میں اس فارسی خط کی پیشکش غالب کی جانب سے ہوئی، جس کا مضمون یہ رہا۔

"فرمان رفتہ است کہ جزوے از تاریخ تاجدارانِ تمرغانیہ بہ نظرگاہ آں والی ولایت والی مرتضوی فرستم

ذرہ پرور مہر گستر آں سواد جزوے چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدح والیٔ عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازاں ہنگامہ آراست از کشور کشایاں تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام۔ باقی داستان بہ فرداست"۔ (غالب)

اس جدت طراز خط نگاری کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"تاریخ تیموریہ سے متعلق آنجناب کا فرمان جدمت ہوا۔ ذرہ نواز! کرم فرما! حضور عالی جاہ میں مزید نہ لکھ سکا حمد و نعت و تعریف ثنا خوانیٔ بادشاہ وقت۔ کتاب کے واقعات جمع کرنیکے بارے میں عرضِ خدمت ہے کہ فاتحین ممالک سے لیکر نصیر الدین سلطان ہمایوں بادشاہ تک کے حالات لکھ چکا ہوں۔ باقی داستان کل پر اٹھا رکھا ہوں"۔

—

خط نویسی کی امتیازی جدت طرازی خط نویسی میں شروع سے آخر تک یہ ہے کہ اس کی تحریر کو عام فہم بولی اور گفتگو کہا جا سکتا ہے۔ اس خط کو بلند آواز میں پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو یا تین افراد آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ اس کی مکتوب نگاری میں پبلک مقرروں کے اسٹیج پر وعظ کی صورت نہیں ہوتی۔ مکتوب نگار واعظ اسٹیج کی شخصیت اختیار نہیں کرتا۔ اسکی بولی اتنی غیر مصنوعی اور اتنی فطری ہے، اس کے جملے اتنے سہل اور چست، اس کا بیان اتنا پاکیزہ اور سیدھا ترشا ہوا ہے کہ طفلِ مکتب بھی اس کے مفہوم پر پہنچ سکتا ہے۔ اس کی مکتوب نگاری مُفسر کی تفسیر کی محتاج نہیں۔ اس کی روانی میں پیچیدگی نہیں ہوتی اس کے خطوط مُفرحات کا کام دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا خط کو لغت کی کم حاجت ہے۔ اس خط کے بیان میں مکتوب نگار کی شخصیت غائب یا مفقود الخبر نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ یہ خط خود آپ ہی اپنی تفسیر ہے۔ مندرجۂ بالا خط سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں تیمور سے ہمایوں تک کی تاریخ مکمل ہو چکی تھی۔

جب حکیم صاحب نے اپنا مضمون مرزا کی خدمت میں ارسال کیا تو مرزا نے مقدمہ کتاب اسکے ساتھ لگا دیا اور اس اردو مسودہ کو فارسی میں ملبوس کیا۔ علم و ادب کی یہ عظیم خدمت جون ۱۸۵۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

اللہ کی غیبی امداد سے مہر نیمروز اگست ۱۸۵۴ء میں مکمل ہوئی۔ ستمبر میں عید الضحیٰ کے موقع پر عید کا ہدیۂ تبریک قصیدے کی شکل میں پیش کرنیکے بجائے تاریخ کا جدید مسودہ شاہ کو نذر کیا۔ اور شاہانہ اعزاز حاصل کیا جس کا خوشگوار حال منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں لکھا ہے:

"حقیر صاحب! میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کردہ نذر کیا۔ اس کا حال سنیئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام پرتوستان رکھا۔ اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اس کا نام مہر نیمروز رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والیٔ عصر تک اس کا نام ماہ نیم ماہ۔ مسودہ مہر نیمروز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائیگا۔ توقع و خوشنودی مجھ کو مل گیا یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر۔ اسکو خلعت فاخرہ اور صلہ گراں تصور کرتا ہوں"۔ (غالب)

تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پرکھا جائے تو اس خط کی جدت طرازی نوبل لاریٹ رابندرناتھ ٹیگور کے لاتعداد خطوط کی یاد تازہ ہوتی ہے جو اس نے یوروپ کے دوران سفر میں اپنے دوست اینڈریوز کے نام ہندستان کو لکھا۔ ان خطوط میں ٹیگور کی وطن پرستی غالب رہی لیکن مندرجہ بالا خط میں غالب کا شاہ عصر کے ساتھ عقیدتمندی کا جذبہ ہے۔ اس لحاظ سے ٹیگور کو ایک لحاظ سے غالب کا ہم خیال اس منطقی زور پر کہا جاسکتا ہے اور غالب کو ٹیگور کا ہم خیال بھی کہنا درست ہوگا۔ ٹیگور نے ادب کو ہی اپنا پہلا مذہب تصور کیا تھا۔ اور مرزا کیلئے بھی (جیسا کہ ان کے اس خط سے ثبوت ملتا ہے) ادب مذہب کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر ممکن لحاظ سے مرزا کو فارسی و اردو شاعری کا شیکسپیر (Shakespeare) اتفاقاً کہنا اسلئے بامحل ہوگا کہ اسکی تاریخ نگاری کی بیت میں حق گوئی اجاگر ہوتی ہے اور یہ سچ گوئی دنیا کی تاریخ لکھنے والے تمام مورخین کے لئے سو فیصدی ضروری ہے۔ یہاں غالب کی شخصیت یقیناً دوطرفی ہے ایک صادق مورخ کی اور دوسری شاعر انقلاب کی یعنی اس کے خطوط کی جدت طرازی میں سیاسی انقلاب ہرگز نہیں بلکہ ادبی لفظی انقلاب ہے۔ اس کی تاریخی حق گوئی اور شاہ عصر کا وفادار شہری مانے جانے کی صداقت پر اس کو انگریزی کے ملک الشعراء شیکسپیر کے یہ تین منتخب سطروں کا انتساب کیا جاتا ہے جو شاعر کے نامور ڈرامے ہیملٹ (Hamlet) کا کلام ہے۔

"To Thine own self be true,
And it must follow, as the night the day
Thou canst not then be false to any man"

SHAKESPEARE in HAMLET"

شیکسپیر کا یہ منتخب کلام غالب کے اس خط کی سو فیصدی تائید اور اس کے تاریخ نگار اصول صداقت کے ساتھ پوری انصاف کرتا ہے۔

اس کے بعد غالب پر ہمارا "ریسرچ" یہ دکھاتا ہے کہ اس کے خط کا یہ قابل غور و یادجملہ: "اب اگر زیست وفا کرگئی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائیگا" ——— امریکہ کے شہید وطن صدر جے ایف کینڈی کے مرحوم ہمعصر ملک الشعراء رابرٹ لی فراسٹ کے ہم فلسفہ ہونیکی غالب کو دعوت دیتا ہے۔ دنیا کے انگریزی کا سب سے بڑا رسالہ "لائف" (LIFE) جس میں ایڈیٹوریل بورڈ نے ان چار منتخب سطروں کی اشاعت کی تھی جس شعر کے عمیق فلسفے میں غالب اور فراسٹ دونوں ہمرکاب ہوجاتے ہیں۔ اور جو شعر دنیا کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں کئی بار دہرایا گیا اور شاعر کے دست نوشت یہ چار مصرعے جنکو ہمارے مرحوم وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے کاروان حیات کے ٹھہر جانیکی تاریخ تک اپنے بستر کے نیچے اپنی زندگی کی یادگار بنائے رکھی تھی وہ یہ ہیں:

The woods are lovely, dark and deep,
And I have many promises to keep,
And miles to go, before I sleep,
And miles to go, before I sleep.

ROBERT-LEE-FROST.

فراسٹ اس لاجواب شعر کے تیسرے مصرعے کو اپنے چوتھے مصرعے میں دہراتا ہے یعنی "مجھ کو میلوں کا سفر طے کرنا ہے سو جانے سے پہلے" (جواہر لال کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اپنی آخری سانس تک اس کو اپنے بستر کے نیچے محفوظ رکھا اور بھارت کے کسی فرد کو خبر نہ تھی کہ یہ شعر بستر کے نیچے پڑا ہے)

یہاں ہمیں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ غالب کے وہ خط کا جملہ "اب اگر زلیست وفا کر گئی تو ماہِ نیم ماہ لکھا جائیگا" اور فراسٹ کے دوسرا اور تیسرے مصرعے غالب کے فلسفہ کو سنہری حروف میں کندہ کرتے ہیں۔ غالب کے خط کے جملے اور فراسٹ کے الفاظ "مجھ کو بہت سے وعدے پورے کرنا ہے اور میلوں کا سفر طے کرنا ہے سو جانے سے پہلے" - ان دونوں مشرق اور مغربی تخیل میں کوئی فرق و امتیاز بالکل نہیں۔ فراسٹ سو جانے سے پہلے بہت دور جانا چاہتا ہے اور غالب زلیست کے ختم ہونے سے پہلے ماہِ نیم ماہ کا ارمغان دنیا کے روبرو پیش کر دینا چاہتا ہے۔

غالب کا یہ خط اسکو موصوف تین شاعروں سے ہم پلہ کرتا ہے۔ یہاں غالب کی شخصیت سہ طرفہ ہو جاتی ہے ایک طرف سے اس کے خط میں ٹیگور کی ادبی مذہبیت ٹیگور سے ہمکلام ہوتی ہے۔ دوسری طرف سے اسکی تاریخ نگاری میں اس کی حق گوئی اس کو شیکسپیئر سے ہمخیال کرتی ہے۔ اور تیسری طرف سے ماہِ نیم ماہ پورا کرنے کا اس کی حیات کا باقی کام اس کو فراسٹ سے ہمجلیس کر دیتا ہے تو مکتوب نگار ان تینوں شعرا کا ہم صف رہا۔

بعنوان "متفرقاتِ غالب" ایک بیاض سید مسعود حسن رضوی یم، اے کی حفاظت میں ہے جس میں مرزا کے چند فارسی خطوط موجود ہیں جو مکتوب نگار نے اپنے چند رئیس کلکتہ احباب کو لکھے تھے۔ خطوط کے ساتھ چند نظمیں بھی شامل ہیں جو شاعر نے کلکتہ میں اپنے قیام کے دوران میں تیار کی تھیں۔ ان فارسی نظموں کے ساتھ ایک غزل اردو میں بھی شامل ہے اس کتاب میں جملہ ۴۹ خطوط ہیں۔ اس کتاب کا پہلا انڈین اڈیشن ہندستان پریس رام پور سے چھپکر سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ رامپور میں ۱۹۴۷ء میں بازار میں رونما ہوا۔

بعنوان "مآثرِ غالب" ایک اور کتاب ہے جس میں مرزا کے چند فارسی خطوط شائع ہوئے ہیں جو رئیس ڈھاکہ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان کی حفاظت میں تھے۔ یہ خطوط مرزا نے کلکتہ و ڈھاکہ میں اپنے چند خاص احباب کو لکھے تھے۔ مرزا کے جامع الخطوط ہونے کا سہرا مرزا کے ایک شاگرد فضل الدین حیدر کے سر ہے اور موصوف سے ہی حکیم مرحوم کو یہ نایاب خطوط ملے تھے۔ مآثرِ غالب پہلی بار علیگڈھ میگزین کے غالب نمبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ ایک عرصہ تک مرزا کی خطوط نگاری فارسی پر محدود رہی غالباً ۱۸۴۹ء کے ابتدائی ایام میں عام طور پر غالب نے اپنی مکتوب نگاری کو الوداع کہدیا۔ اس کے بعد آخر دم تک اردو مکتوب نگاری ہی کو اپنا ذریعہ اطلاعات بنا رکھا۔

مرزا کے اردو خطوط کا ایک گلدستہ سجانیکا افتخار میرٹھ کے ممتاز علیخاں کو حاصل ہوا۔ موصوف نے چودھری عبدالغفور سرور سے ان خطوط کا مجموعہ حاصل کیا۔ اس کے ساتھ سرور نے وہ خطوط بھی ممتاز کے حوالے کر دئے جو مرزا نے صاحب عالم وشاہ عالم صاحبان کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط پر ایک مقدمہ بھی لکھا گیا انہوں نے اس مجموعہ کی چھپائی کو التوا کر کے

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے تعاون سے ۲۷ خطوط کا اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ چند نظمیں اور نثریں بھی ملا دیں۔ یہ مجموعہ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں پہلی بار مرزا کی وفات سے کوئی چار ماہ پہلے میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے عودِ ہندی کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن اس کی ترتیب میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ طلبگاروں کے تقاضے صادر ہونے لگے تو مرزا نے پریشان ہو کر تمام خطوط کے مراسلات کی طلبگاری بے خبر سے کی۔ جتنے بھی خطوط موجود ہیں ان کی نقل روانہ کر دینے کی تاکید کر دی۔ بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علیخاں کیا کر رہے ہیں، رقعے جمع کئے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں انکی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپکو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپکو پہنچے ہیں وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھکو بھیج دیں۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"
غالب

جب منشی ممتاز علیخاں کی جانب سے اشاعتِ خطوط میں ایک غیر متوقع طویل تاخیر ہو گئی تو مرزا کو گمان ہوا کہ وہ چھپائی کے کام سے باز آ گئے ہیں۔ مرزا کی اس مایوسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواہر سنگھ جوہر نے میر فخر الدین کا ساتھ دیکر خطوط جمع کرنا شروع کیا۔ مئی ۱۸۶۳ء میں نواب علاء الدین کو مرزا نے یہ خط لکھا۔

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا جو لکھا وہ جہاں بھیجنا تھا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہونگے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیل ڈاک بھیجدو گے یا آجکل میں کوئی ادھر آنیوالا ہو اس کو دیدو گے تو موجب میری خواہش کا ہوگا۔" غالب

اس خط کی تحریر سے پانچ سال پہلے مرزا نے منشی شیو نرائن کی التماس کو ٹھکرا دیا تھا۔ اسی التماس پر اب راضی ہو گئے کیونکہ عمر کے تقاضے سے مرزا کیلئے اس ردِ عمل کا نازک وقت آ چکا تھا۔ نرائن کو انکار کا جو خط لکھدیا تھا اس کا مضمون یہ ہے۔

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اسکی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھپوانا میرے خلاف طبع ہے۔" غالب

اب مرزا اس کام کے لئے فوری گرمجوشی سے مجبور ہو گئے۔ کیونکہ گردشِ زمانہ سے ان کی صحت بھی جواب دے چلی تھی۔ خیر خواہوں کے تعاون سے یہ مجموعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو اردوئے معلیٰ کے عنوان سے چھپ گیا مگر افسوس کہ اس عالمگیری کتاب سنہری کارنامے کی رونمائی مکتوب نگاری کے اس بلند دماغ معمار کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ اس کتاب کی جلوہ گری سے انیس (۱۹) روز پہلے ۱۸۶۹ء میں یہ معمارِ ادب عازمِ خیابانِ جاودانی ہو چکا تھا۔

بقول شیکسپیر ؎

"Death the undiscovered country
from where no traveller returns"

— SHAKESPEARE —

فارسی و اردو کا یہ شیکسپیر ارضِ آدم و حوّا سے ہمیشہ کیلئے جلا وطن ہو گیا۔

مرزا کے مکمل ارمغانِ خطوط نگاری کیلئے ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہیں تو اس مختصر مضمون میں ان تمام خطوط کا سانچہ ڈھالنا ایک قطعی ناقابل امر ہے۔ یہ چند خطوط ہی ان کی ادبی بحرِ لو قیانوس پر گہری روشنی ڈالنے کے لئے ایک حد تک کافی ہے کیونکہ یہ ان کی حیات کے اور شاعرانہ روحانیت کے عکاس ہیں۔

لفظی جامعیت میں شیکسپیئر کا ہم پلّہ، شیریں زبانی میں ٹیگور کا ہم نوالہ و ہم پیالہ، عملی فلسفہ میں فراسٹ کا ہمجلیس، شاعرانہ نکتہ وری میں قدیم یونانی شاعر ورجیل (VIRGIL) کا ہمرکاب، الفاظ بندی میں ملٹن کی فلک زبانی کا ہم سخن اسکے شاعرانہ کلام سے متاثر ہیں۔ ان کا جدت طراز شاعرانہ کلام بحرالکاہل ہے جس کا وہ "امیر البحر" ہے۔ ان کے فلسفیانہ کلام میں بے تمثیل انفرادیت زمانۂ قدیم کے مشہور شاعر و فلسفی ڈانٹے (DANTE) سے ملتی جلتی ہے اور انکی فلسفہ آرائی میں قدیم ترین مفکرینِ یونان کا وہ محاورہ لہریں لیتا ہے۔

Philosophy is the guide of life.

(فلسفہ حیات کا رہبر ہے)

غالب کا کلام مبارک یونانیوں کے اس فلسفہ سے لبریز ہے۔ مشرقی شعراء ان کے مقتدی ہیں اور وہ ان کے مقبولِ عام امام ہیں۔ شاعر کبھی نہیں مرتا اس لئے ہم مرزا کو حیات آوری کے نعروں سے زندۂ جاوید کر دیتے ہیں۔

— غالب زندہ باد —

"اردو میں میرؔ، نظیرؔ، سوداؔ اور انیسؔ سب کے یہاں ایسی تصویریں ملتی ہیں۔ مگر غالبؔ کی تصویریں علاوہ حسین ہونے کے خیال انگیز ہیں۔ ان میں ایک نہ ایک بات ماورائے سخن رہ جاتی ہے۔"

(آل احمد سرور)

عائشہ علی محمد
بی ایس سی (سال اول)

مرزا غالب کے لطائف و نوادر

لطیفہ نام ہے اس ظرافت کا جس میں کسی چھوٹے سے واقعہ کو ظرافت کی چاشنی دیکر اختصار کیساتھ بیان کردیا جائے۔ اس میں کوئی خاص چیز ایسی نہیں ہوتی جسے لطیفے کے مخصوصات میں شمار کیا جائے البتہ حسنِ بیان اور طرزِ ادا کی قید بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر لطیفہ معمولی گفتگو سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس میں بھی دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں ایک کسی واقعہ کا بذاتہ انداز دلچسپ ہونا جس میں حسن پیدا ہو جائے دوسرا کسی واقعہ میں اندازِ بیان سے کوئی خاص ندرت پیدا کرنا چنانچہ ذیل میں اس قسم کے کچھ لطائف درج کئے جاتے ہیں۔

• حکیم سولن کا ایک لڑکا مر گیا اور اس کے غم میں رویا۔ لوگوں نے کہا کہ رونے سے کیا فائدہ حکیم نے جواب دیا کہ بس اسی لئے روتا ہوں کہ رونا بیکار ہو گیا۔

• شیخ سعدی ایک مکان کی خرید و فروخت میں مشغول تھے وہاں ایک یہودی رہتا تھا اس نے شیخ کو ترغیب دی کہ خرید لیجئے میں اس کا ہمسایہ ہوں اس مکان میں کوئی عیب نہیں ہے سعدی نے جواب دیا بس یہی عیب ہے کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔

• ایک یونانی پہلوانی کرتا تھا لیکن کشتی کے موقع پر ہمیشہ پچھاڑا جاتا تھا۔ آخر کار اس نے پہلوانی چھوڑ کر طبابت سیکھنی شروع کی۔ سقراط نے اس کو اس فن میں مصروف دیکھکر کہا کہ اب تم لوگوں کو پچھاڑا کرو گے۔

• سقراط کی بیوی اس وقت بہت رو رہی تھی جب سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا تھا۔ سقراط نے پوچھا کہ تو کیوں روتی ہے۔ کہا اس لئے کہ تو بے گناہ مارا جاتا ہے۔ سقراط نے کہا' اری کمبخت کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کسی گناہ پر مارا جاؤں۔

یہ لطائف جو لکھے گئے ہیں ان میں وہ ظرافت جو صرف مشاق اور ظرافت آگاہ لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہے عوام کے لطائف قصداً نظر انداز کئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں ظرافت بالقصد اکثر نہیں پائی جاتی۔ دوسرے اسی قسم کے لطائف اس قدر مشہور ہیں یہاں ان کا لکھنا بیکار ہے۔ کہیں نہ لطیفہ ہوتا ہے' نہ ہزل نہ پھبتی نہ پھکڑ' بلکہ ظرافت کا دار و مدار دوسری چیزوں پر رکھا

جاتا ہے کہیں اپنی اصلی وضع یا اصلی گفتگو کو چھوڑ کر کسی دوسرے فرقے کی گفتگو اختیار کی جاتی ہے۔ کہیں بالکل بے معنی بات کہی جاتی ہے اور اس کو سن کر سننے والے کو ہنسی آتی ہے کہیں ایک زبان میں دوسری زبانوں کی آمیزش کر کے اور گفتگو کو معجون مرکب بنا کر ظرافت پیدا کی جاتی ہے۔ کہیں واقعات مضحک کا بطریق تلمیح ذکر کیا جاتا ہے کہیں کسی شعر کی غیر موزونی ہی ظرافت اور ہنسی کا سبب ہوتی ہے۔

ان سب باتوں کے بعد یہ نتیجہ بآسانی نکل آتا ہے کہ انسان کی ہنسی کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی بات کہی جائے جو معمول سے ہٹی ہوئی ہو۔ یا ایسا کام کیا جائے جو مروج نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایک کمزور مریض کو چلتے اور ڈگمگا کر گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی نہیں آتی بلکہ جب ایک جوان طاقتور کو کہیں پھسلتے گرتے دیکھتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی غیر متوقع اور غیر معمولی بات سے ہنسی نہ آئے مگر یہ مسلّم ہے کہ ہنسی جب آئے گی وہ غیر معمولی بات پر یا غیر متوقع واقعہ ہی سے آئے گی۔

اسی سلسلے میں جب ہم مرزا غالبؔ کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کستے ہیں نہ ظرافت کے لئے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں۔ نہ لطائف پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں۔ خوشی کی جگہ خوشی اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لاتے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں مگر ان کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اسی سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ رواداری میں ایک بات کہتے مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا۔ غالبؔ کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی' بات میں بات پیدا کرنا اور بڑی سے بڑی بات چٹکیوں میں اڑا دینے میں مرزا اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ لکھتے ہیں:

"نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اکبرآبادی کی تقریر میں انکی تحریر اور انکی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اسقدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنا انکی خاص خصوصیات میں سے تھا۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف کی تیار ہو جاتی۔

مولانا نے اپنی تصنیف "یادگار غالبؔ" میں زیادہ سے زیادہ لطیفے جمع کئے ہیں شمس العلماء مولانا آزادؔ نے "آب حیات" میں ادبی روایات غالب کو جگہ دی۔ "اردوئے معلیٰ" میں واقعات کی بعض عبارتیں لطیفہ اور ظرافت کا چٹخارہ لئے ہوئے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور ان کی امیجنیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے

• ایک مرتبہ مرزا گھر میں جانے لگے تو دیکھا بیگم صاحبہ عین صحن میں مصلا بچھائے ہوئے نماز پڑھ رہی ہیں۔ مرزا صاحب یہ دیکھکر دروازے پر ٹھہر گئے جب وہ نماز پڑھ چکیں تو آپ نے جوتہ اتار کر سر پر رکھا اور برہنہ پا آہستہ آہستہ ڈرتے ہچکچاتے ہوئے صحن تک آئے' بیگم نے یہ حالت دیکھی تو مسکرا کر تعجب سے پوچھا یہ کیا' آپ نے جواب دیا کہ کچھ نہیں آپ کے مصلے کی تعظیم و تکریم منظور ہے' انہوں نے تشریح چاہی تو آپ نے جواب دیا کہ اب صحن تو مسجد ہو گیا پھر اگر کوئی قدم رکھے

توکہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے اس لئے جوتا اتار کر سر پر رکھ لیا ہے۔

• ایک دن مرزا غالب، صاحب عالم فتح الملک بہادر سے ملنے گئے۔ جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمتگار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ آرہے ہیں وہ کسی کام میں تھے فوراً بلا نہ سکے۔ مرزا غالب وہیں ٹہلتے رہے صاحب عالم نے کچھ دیر بعد ملازم سے پکار کر فرمایا ارے دیکھ مرزا صاحب کہاں ہیں۔ مرزا غالب نے وہیں سے جواب دیا' غلام گردش میں ہے۔
صاحب عالم ہنستے ہوئے نکل آئے اور ساتھ لے گئے۔

• ایک مرتبہ مغفرت کا کچھ ذکر چلا بیوی نے کہا کہ آپ تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھتے روزہ تو خیر بڑی چیز ہے۔ آپ نے کہا کہ خیر یہ تو ٹھیک ہے مگر تم سے ہمارا حشر اچھا ہوگا۔ بیوی نے پوچھا کہ یہ کیوں تو آپ نے کہا کہ آپ تو انہیں نیلے تہمد والوں کیساتھ ہوں گی جن کے تہمد کے پلے میں مسواک' ہاتھ میں ایک ٹوٹی دار بدھنی ہوگی' سر منڈھے ہونگے اور ہمارا حشر بڑے بڑے جلیل القدر عالی نسب بادشاہوں کے ساتھ ہوگا جیسے فرعون' نمرود' شداد۔ اور ہم مونچھیں چڑھاتے اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہونگے۔ چار فرشتے ادھر جلو میں ہونگے چار ادھر۔

• ایک مرتبہ آپ کسی کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے' اتنے میں ایک نوجوان ایرانی آیا اور دکاندار سے دریافت کیا کہ دیوانِ غالب داری۔ دکاندار نے جواب دیا کہ دیوان غالب ندارم۔ دیوانِ ظہوری دارم۔ دیوان نظیری دارم ایرانی نے پھر کہا کہ نے نے' اینہمہ مطلوب نیست۔ دیوانِ غالب داری؟ آں قوم ساق خوب میگوید۔ دکاندار نے کہا کہ دیوان غالب ندارم' غالب دارم۔ جب اس نے سنا کہ غالب دارم اور مرزا کو دیکھا تو بہت ہی شرمندہ ہوا۔ مرزا ہنسکر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے کہ شرمانے کی بات نہیں ہے۔ واللہ ساری عمر میں یہی داد آج ہی مل رہی ہے۔

• ایک دفعہ مرزا صاحب کسی دعوت یا مشاعرہ سے واپس آرہے تھے' رات زیادہ گذر گئی تھی مولانا فیض الحسن صاحب فیض سہارنپوری بھی ہمراہ تھے۔ ایک تنگ گلی سے ہو کر گذر رہے تھے۔ آگے ایک گدھا کھڑا تھا۔ مولانا فیض نے کہا کہ مرزا صاحب دلی میں بہت گدھے ہیں۔ مرزا صاحب نے بیساختہ کہا کہ نہیں صاحب باہر سے آجاتے ہیں۔ مولانا جھینپ کر چپ ہو رہے۔

• مرزا صاحب سے کہا گیا کہ آپ اپنی ثقل سماعت کا علاج نہیں کرتے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ دو وجہ ہے۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں بہشتی ہو گیا' دوسرے مرنے کے بعد جب نکیرین سوال کریں گے کہ من ربک ومادینک تو عذر گراں گوشی سے ہاں ہوں کر کے ٹال دونگا۔

• زین العابدین خاں عارف کی بہو' باقر علیخاں کی بیگم بگا بیگم صاحبہ نے حمید احمد خاں صاحب کو غالب کے بارے میں سنایا کہ:

مرزا صاحب پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس (بیگم غالب) عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی تخت کے نکڑ پر ہو بیٹھے جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے "واہ واہ' خوب بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بوٹنے کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے۔

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے حمید احمد خاں صاحب کو سنایا کہ:

• برسات کے دن تھے مینھ بہت برسنے لگا دونوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے میں گاؤ تکیے کے کونے سے لگی بیٹھی تھی، کہنے لگے۔" ایک بیوی دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ہو۔ میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں تم کیوں بیٹھی ہو" اس پر میری ساس بولیں" ارے توبہ توبہ بڈھا دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کیلئے کوئی چاہیئے اب بہو ہی مل گئی"۔ میں اتنے میں اٹھکر کونے میں جا چھپی اب انہیں یہ فکر کہ برسات کا موسم اور کیڑے پتنگے کا عالم، مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں "مجھے کیا خبر تھی کہ بہو اس بات کا اتنا بُرا مانے گی۔

• ایک صاحب مرزا صاحب سے ملنے آئے صبح سے دوپہر ہو گئی اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے مرزا عام معمولات روکے ہوئے بیٹھے تھے۔ جب مرزا عاجز ہو گئے تو نوکر سے کہا صندوقچے میں قبالا اس مکان کا نکال کر آپ کے سپرد کردو۔ وہ صاحب پشیمان ہو کر رخصت ہو گئے۔

• ایک خط میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

"آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں"۔

• اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے، ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا اس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں" میاں، بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے نہ ملا تو غم تو ہے ——— ایک صاحب کو خط میں لکھتے ہیں۔" پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں"۔ "پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں"۔

• زبان کے متعلق مرزا کا لطیفہ مشہور ہے:۔

دلی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں، کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ "حضرت! رتھ مونث ہے یا مذکر؟"۔ آپ نے کہا" بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔"

• جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں رہنے لگے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا" کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔

• سنا ہے کہ مرزا جب کرنل براؤن کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پیاپاخ ان کے سر پر تھی۔ انہوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا" ول، تم مسلمان؟"۔ مرزا نے کہا" آدھا" کرنل نے کہا" اس کا کیا مطلب"؟ مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا"۔ کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا پھر مرزا نے وزیر ہند کی چٹھی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی دکھائی۔ کرنل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا "میں چار کہاروں کا افسر تھا وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے! میں کیونکر حاضر ہوتا؟" کرنل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت

کر دیا۔

● جب نواب یوسف علیخاں کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لئے رامپور گئے چند روز بعد کلب علی خاں مرحوم کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے [illegible] طور پر مرزا صاحب سے کہا۔ "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپکے سپرد کیا" آپ پھر الٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

● شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ سے کسی نے پوچھا کہ" مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں"؟۔ انہوں نے کہا" ایسا ہی دخل تھا جیسے مجھے شاعری میں ہے"۔

● ایک دفعہ جب رمضان گذر گیا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا" مرزا تم نے کتنے روزے رکھے"؟۔ عرض کیا" پیرو مرشد ایک نہیں رکھا۔"

● ایک صحبت میں مرزا میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے انہوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا۔" میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"۔

● ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا بہت قلیل تھا۔" مرزا نے مسکرا کر کہا۔" اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔

● حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایکدن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنا گدھا لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بیشک گدھا نہیں کھاتا۔

● مرزا کے خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز میر مہدی مجروح اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا" بھئی! تو سیدزادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟" انہوں نے نہ مانا اور کہا" آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دیدیجئے گا"۔ مرزا نے کہا" ہاں اس کا مضائقہ نہیں"۔ جب وہ پیر داب چکے" انہوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا" بھیا! کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے" میں نے تمہارے پیسے دابے" حساب برابر ہوا۔

● ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے۔ اس کا دیوانخانہ تو پسند آگیا مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اسکے دیکھنے کیلئے بی بی کو بھیجا وہ دیکھکر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انہوں نے کہا" اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں"۔ مرزا نے کہا" دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی بلا ہے"۔

● ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اسطرح لکھتے ہیں:-

" دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب

تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔

• بہن بیمار تھیں آپ عیادت کو گئے پوچھا "کیا حال ہے" - وہ بولیں کہ "مرتی ہوں، قرض کی فکر ہے کہ گردن پہ لئے جاتی ہوں"۔ آپ نے کہا کہ "بوا! بھلا یہ کیا فکر ہے! خدا کے ہاں مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑ والیں گے۔

• ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے، قرض خواہوں نے نالش کر دی، جوابدہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی جس وقت عدالت میں پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ✣ رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایکدن

•

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بہادر شاہ ظفر نے مقطع سن کر داد دی کہا بھئی ہم تو تب بھی ولی نہ سمجھتے غالبؔ نے جواب دیا "پیر و مرشد تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پہ کہیں مغرور نہ ہو جاؤں۔

• مرزا غالبؔ میر مہدی مجروحؔ کے یہاں گئے، مجروحؔ بیحد خوش ہوئے، استاد کی خاطر مدارت کے بعد مرزا صاحب کی اصل تواضع نہ کر سکے تو ایک غزل سنائی جس کا مقطع کہتے ہیں ؎

غالبؔ آئے ہیں لاؤ اے مجروحؔ ✣ بادۂ ناب میں ملا کے گلاب

مرزا صاحب مسکرا دیئے اور رخصت ہو آئے۔

• مولانا خواجہ غلام غوث بیخبر خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹننٹ گورنر اضلاع مغربی و شمالی دہلی آئے مرزا صاحب سے ملنے گئے۔ مرزا صاحب کو جناب بیخبر سے خصوصیات تھیں دیکھکر خوش ہوئے۔ مگر مرزا صاحب کا حال پھنسی پھوڑے سے پتلا ہو رہا تھا۔ تکلیف سے زندگی کے عاری تھے۔ بیخبر صاحب نے پوچھا "حضرت کیا حال ہے"۔ کہنے لگے ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
اک مرگِ ناگہانی اور ہے

▲

کتابیات :- ۱) آئینۂ غالبؔ ۲) مرزا غالبؔ کی شوخیاں، آسی مرحوم ۳) غالبؔ کے لطیفے - مرتبہ شہابی
۴) یادگار غالبؔ، حالی ۵) غالبؔ کی نادر تحریریں، خلیق انجم و دیگر رسائل۔

کریم عاقل تماپوری
یم اے (سالِ اول) میسور یونیورسٹی۔

کلامِ غالب پر اجمالی نظر

افلاطون نے یونان کا نقشہ جب مجلس شوریٰ میں پیش کیا تو اہلِ ہنر نے خوب سراہا۔ اسلئے کہ پیشوں کے نقطۂ نظر سے نقشہ مکمل تھا۔ ثقافتی نقطۂ نظر سے شہر کی بستیاں بسائی گئیں جس میں صناعوں کے کارخانے، فنکاروں کے محلے، پہلوانوں کے دنگل اور سورماؤں کے اکھاڑے، طوائفوں کے کوٹھے، رقص و سرود کی محفلیں اور دانشوروں کی مجالس غرض یکے بعد دیگرے بڑے سلیقے سے شہر کا پلان تیار کیا گیا تھا۔

معترض نے اہلِ مجلس کی توجہ مبذول کروائی کہ نقشہ ناقص ہے۔ اسلئے کہ اس میں شاعر کا کہیں مقام نہیں۔ شاعر کے وجود ہی سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ اور جس شہر میں شعر و سخن کو جگہ نہ ملے تو وہ ایک ویرانہ ہے اور ایک بے آب و گیاہ زمین ہے۔ جہاں خزاں کے سوا کچھ نہیں۔

شاعر پیشہ ور نہیں ہوتا اور نہ ہی شعر گوئی کسبِ معاش کا ذریعہ ہوتی ہے بلکہ "جزو یست ز پیغمبری" کے مصداق جس کا ایک ایک شعر بانگِ اسرافیل اور نغمۂ جبریل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے تمام قید و بند سے آزاد مگر انسانیت کی لگام تھامے ہوتا ہے۔

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

کے مصداق وہ اس وسیع کائنات میں کس مخصوص خطۂ زمین کے لئے ہوتا ہے؟ زندگی کے کن پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالتا؟ ماضی کی یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر انسانوں کو ابھارتا ہے۔ اور مستقبل کی آئیڈیل زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ الغرض شاعری شاعر کے اس ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ احساساتِ انسانی اور تجرباتِ زندگانی ماحول ہی سے اخذ کرکے اس میں ایسا رنگ بھر دیتا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اپنا اپنا رنگ نظر آتا ہے۔

غالب کی شاعری بھی افلاطونی دعوٰی کے مطابق صد فی صد صحیح نظر آتی ہے۔ غالب کا مقام نہ تو دلی معلوم ہوتا ہے اور نہ آگرہ بلکہ ان تمام کروڑوں انسانوں کے قلوب ہیں جن میں وہ جاگزیں ہوگیا ہے۔ کیا بچہ کیا بوڑھا کیا دہقان اور کیا تعلیم یافتہ سب کے دلوں میں پرورش پا رہا ہے۔ قریہ سے لیکر شہر تک اور مغرب سے لیکر مشرق تک غالب ہی غالب نظر آتا ہے۔

نیاز فتح پوری نے صحیح ہی فرمایا ہے "یاد رکھئے زمانہ جس قدر ترقی کرتا جائیگا غالب کے پرستار بھی بڑھتے جائیں گے۔ کیونکہ یہ دور روحانیت وجذبات کا نہیں ہے بلکہ مادی ترقی اور عشرت طلبی کا ہے، دنیا حزن وملال سے بیزار ہوکر اب نشاط و مسرت کا تعاقب کررہی ہے...... اور چونکہ کلام غالب کی بنیادیں طربیہ جذبات پر قائم ہیں اسلئے اس کو مقبول ہونا چاہیئے۔ اور جوں جوں انسانیت دنیاوی ترقی میں آگے بڑھتی جائیگی اتنی ہی زیادہ مقبولیت اس کو حاصل ہوتی جائیگی"۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہر زمانے میں بعض ہستیاں قبل از وقت ایسی پیدا ہوجاتی ہیں جو آنے والی نسلوں کے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔

غالب چونکہ ماہر نفسیات کے علاوہ ایک خودآگاہ شاعر ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن مستقبل کے درپردہ حقیقتوں اور اور پوشیدہ مذاق سے واقف تھا۔ اس لئے ان کی ہر بات میں جذبۂ انسانی کی تصویر ملتی ہے۔ زندگی کی چاشنی اور مستقبل کا ذوق مذاق بھی ملتا ہے۔ الغرض غالب کی شاعری ماضی، حال اور مستقبل میں اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ جب بھی ماضی حال میں بدل جاتا اور حال مستقبل میں تبدیل ہوجاتا تو پوشیدہ حقیقتوں کا راز افشا ہوجاتا۔ اور ایک نیا فلسفہ اور ایک نیا ذہن لوگوں کو مل جاتا۔ عموماً شعر وشاعری اور بالخصوص صنف غزل کی جب بھی تجدید ہوتی رہیگی تو غالب بھی اسکے مجدد بن کر زندہ ہوتے رہینگے۔ شاید غالب نے اسی پوشیدہ حقیقت کے تحت یہ فرمایا تھا کہ "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

شاعری کی عظمت کا تعلق محض پاکیزگیٔ جذبات سے نہیں بلکہ اظہار جذبات سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ کہ دل سے بات نکلے اور سیدھا دل میں جا بیٹھے۔ بلند سے بلند خیال بھی پست ہوجاتا ہے۔ اگر اس کو سلیقہ سے پیش نہ کریں۔ اسیطرح سے معمولی سے معمولی بات بھی دلکش اور موثر ہوجاتی ہے جب کہ اس کو ایک بہتر انداز سے پیش کریں۔ اسلوب اگر موزوں نہ ہو تو گفتنی ناگفتنی بن جاتی ہے اور موزوں ہو تو ناگفتنی گفتنی۔" یہی اسلوب بیان کی جدت و ندرت اور قوت جذب واظہار غالب کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جو غالب کے فن کو غالب کی شاعری کو ہمہ گیر بناتی ہے ۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا ؛ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

قدرت نے انہیں وہ قدرت عطا کی تھی کہ وہ ہر معمولی بات کو احساسات کے ساتھ اخذ کرکے پورے جذبات کیساتھ لوٹا دیتے۔ اور ہر مشکل سے مشکل بات کو عام فہم اور سہل بنا کر پیش کرتے۔ جس سے مرزا کی عظمت، جامعیت اور شخصیت کا اعتراف نہ صرف سخنوروں کو ہوتا ہے بلکہ نقادان ادب کو بھی شدت کے ساتھ ہوتا ہے ۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ؛ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

زبان میں انہوں نے وسعت پیدا کی، لچک پیدا کی، گیرائی پیدا کی اور تنوع پیدا کی اسی باعث اردو زبان نئے نئے محاورات اور نئے نئے خیالات سے روشناس ہوئی۔ نئی نئی دل آویز اور دلکش ترکیبیں عالم وجود میں آئیں اور زبان کو حسن بیان ملا حسن بیان کو زبان ملی۔" اور ادائے مطالب کی دل آویز اور عام فہم صورتیں دماغ کی دنیا سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئیں ۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی ؛ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب ؎ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

زبان کی جدت اور بیان کی ندرت کے علاوہ شوخی و ظرافت کے عنصر بھی کلام میں اسقدر غالب ہیں کہ ان کو حیوانِ ظریف کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ان کی شوخی و ظرافت وہ ہے جو کبھی تبسم زیرِ لب سے آگے نہیں بڑھتی۔ مگر قارئین اپنے آپ کو اسے تر و تازہ محسوس کرنے کہ شاید قہقہوں کے بعد بھی ممکن نہیں۔ بھونڈا پن اور پھکڑ سے ماورا دامنِ شائستگی ہی میں ایسی سرزوشی کرتے ملیں گی جیسے ہرن کا بچہ جس چونچ شوخی اور جس چنچل پن سے اپنی ماں اور گرد محبت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اردو ادب میں شوخی و ظرافت کی کئی مثالیں ملتی ہیں مگر "ظرافت اور متانت' ظرافت اور حسرت' ظرافت اور حقیقت' ظرافت اور نصیحت" کا حسین امتزاج جو کلام غالب میں نظر آتا ہے وہ دیگر شعراء کے کلام میں مشکل سے نظر آئیگا۔

انشاء کی ظرافت بڑھتے بڑھتے ابتذال کا جامہ اوڑھ لیتی ہے۔ سودا کے ہاں آہستہ آہستہ ہجو گوئی اور نشتریت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح نظیر کی ظرافت تیر و نشتر سے لیس دلوں کو چھید کرتی چلی جاتی ہے۔ مگر غالب کی ظرافت ہے کہ لیس نہ تیر نشتر ہے اور نہ ابتذال کی کیفیت سے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ ؎ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اور پھر — خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ ؎ کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کبھی خلد میں ان کو پری زادوں سے انتقام لینا سوجھتا ہے اور کبھی فرشتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ صحیح معنوں میں مرزا نے زبانِ اردو کو "ظرافت' ظرافت کو ادبی رنگ اور ادبی رنگ کو افاقیت بخشی ہے۔"

غالب اور دیگر شعراء کا تقابلی جائزہ لیں تو غالب کے یہاں بہت سی ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں جو غالب کو دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔

میر گر حزن و ملال کی تصویر ہیں تو سودا ایک مجلسی انسان کا نمونہ۔ میر درد و سوز و گداز اور لوائے جگر خراش کے تاثرات کو جس خوبی سے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ دوسرے تاثرات کو پیش نہیں کر سکتے ع

درد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

یاس و غم ان کی زندگی میں اسقدر رچ بس گیا ہے کہ کیف و سرور اور ساغر و مینا کی بات بھی کرتے ہیں تو بے کیف سی معلوم ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو ان کے ہاں جگر ہی کہاں تھا جو زندگی کرتے۔ اس کے برخلاف سودا ہر وقت ہر آفت کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ تلخیِ ایام کی چکی میں پس کر بھی یاس و غم کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ طریقہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی انفرادیت کی مدافعت ہو سکے۔ وہ جتنا چوٹ کھاتے ہیں اتنا ہی سخت اسکا جواب بھی دیتے ہیں۔ طنز و ظرافت کے تیر سے دلوں کو چھید کرتے ہیں۔ اور ہر چیز کا مضحکہ اڑاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن غالب کے یہاں درد و غم بھی ہے اور طنز و ظرافت بھی' اس کو "خدائے سخن" بھی کہا جا سکتا ہے۔ "حیوانِ ظریف بھی کہلا جا سکتا ہے اور "شہنشاہِ غزل" بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر غالب تصویرِ غم بن کر آتے ہیں اور نہ تیر و نشتر بن کر۔ بلکہ ہر وقت ایک مکمل انسان کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

اسی طرح درد کا حال بھی ان دونوں سے کچھ جدا نہیں۔ وہ زندگی کی ہر پیچ و خم کو تصوف کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ کائنات کے بے شمار جلوے بھی حسنِ حقیقی کے روپ میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ عالمِ مجاز ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ تصوف و فلسفہ غالب کے یہاں اگر ان کی شخصیت میں کچھ اسطرح جذب ہوکر حقیقت و مجاز کا امتیاز ہی مشکل ہوجاتا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

—

نہ تھا میں تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غرض غالب کے کلام کو کوئی وید مقدس سمجھتا ہے تو کوئی نئی نسل کی انجیل، کوئی اس میں فلسفہ و تصوف کے مسائل پاتا ہے تو کوئی کیف و سرور کے نغمے اسلئے اس کو ایک صوفی و خلوت نشیں بھی پڑھتا اور رندِ شاہد باز بھی اور لطف یہ کہ ہر شخص مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور بے ساختہ کہتا ہے ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

"غالب کی بیوی کے نقش و نگار گلستاں در گلستاں تنقید کی نظروں کے سامنے جلوہ فروش ہوتے آئے ہیں۔ شیفتہ اور حالی سے لیکر آج تک گو اس کے اسرار و رموز اس کے دلنواز گوشے اور دلکش پہلو بے نقاب ہوتے رہتے ہیں پھر بھی غالب کی فکر کا مکمل تصور منور اپنے کو ملبس کے انتظار میں ہے اور یہ عظیم دریافت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک علوم متعلقہ کی مدد سے غالب کے عہد اور ان کے فن کے ارتقا کا ایک مربوط خاکہ تیار نہ ہوجائے"۔

(ڈاکٹر محمد حسن) -

غزلیں

پروفیسر سید ابو تراب خطائی ضامن
صدر شعبۂ اردو و فارسی مہارانی کالج میسور

ساغر اٹھا و زیست کے عنوان بدل گئے
چھیڑو رباب نیند کے ماتے سنبھل گئے

شاید ہماری پیاس سمندر بجھا سکے
دو چار گھونٹ پی کے کمینے بہل گئے

کس رشکِ ماہتاب کا آنچل ڈھلک گیا
دیوار و در بھی نور کے سانچے میں ڈھل گئے

ٹوٹتے ہوئے قدم کے نشاں چھوڑ کر چلے
کب کے رکے ہیں قافلے آئے نکل گئے

ناکامیوں نے ساتھ نہ چھوڑا تمام عمر
منزل کے پاس آ کے دوانے مچل گئے

دیوان بجائے نامۂ اعمال رکھ دیا،
ضامن خدا کی شان میں کیا چال چل گئے

جناب مظہر الصمد شاہد ایم اے بی ایڈ
ٹریننگ کالج میسور

تمیز آشنا نا آشنا کیا
محبت کے لئے کھوٹا کھرا کیا

کرشمے ہیں مری بے تابیوں کے
ادائے حسن کیا حسنِ ادا کیا

الٰہی کارزارِ رنگ و بو میں
فریبِ آرزو کی انتہا کیا

سمجھ میں آج تک اپنی نہ آیا،
نگاہِ یار کا ہے مدعا کیا

ذرا ہو جائے دھڑکن تیز دل کی
ہماری آرزو اس کے سوا کیا

بھری محفل میں ٹھنڈی آہ بھر لی
ارے ظالم یہ تو نے کر دیا کیا

اچانک دل میں کس کی یاد آئی
یہ مجھ کو بیٹھے بیٹھے ہو گیا کیا

ڈبو بیٹھے سفینہ آپ اپنا
شکایتہائے جورِ ناخدا کیا

مری خاموشیوں پر جا نہ ہمدم
شکستہ ساز ہوں میری صدا کیا

مزا مر مر کے جینے میں ہے شاہد
"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

جناب اقبال فرید
میسور

رخ سے پردہ اٹھا گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

دل کی تاریکیوں میں برق آسا!
اپنا جلوہ دکھا گیا کوئی

میری دنیا کو کر گیا روشن
خرمنِ دل جلا گیا کوئی

ذکر جب بھی وفا کا نکلا ہے
مجھ سے آنکھیں چرا گیا کوئی

چند لمحے ملے تھے ہنسنے کے
جانے کیوں یاد آ گیا کوئی

چھیڑ کر میرے دل کے تار فرید
یادِ ماضی دلا گیا کوئی

شمس النساء
بی ایس سی (سال دوم)

انقلابِ فیشن

ہوا ایسا انقلاب آیا جہاں سے اٹھ گیا پردہ
کہو پردہ نشینوں سے تمہارا کیا ہوا پردہ

ہوا فیشن سے دنیا میں کچھ ایسا شرمگیں پردہ
خجالت بڑھ گئی خود ہو گیا پردہ نشیں پردہ

حیا روشن سے پردہ اٹھ گیا جس دم شباب آیا
جہاں میں بے حیائی بڑھ گئی یہ انقلاب آیا

غضب ہے لڑکیاں ہر سو ہوا کھانے کو جاتی ہیں
حیا کہتی ہے میرا نام دنیا سے مٹاتی ہیں

ادا میں ایسا جادو جس سے عیاں ہوتی ہے عریانی
یہ سب فیشن کا طوفاں ہے اسی کی ہے طغیانی

کسی نے ریشمی کپڑے کا جمپر گھر میں سلوایا
بلوز اپنا کسی نے ناپ کر درزی سے سلوایا

کسی نے اونچی ایڑی کا منگا کر بوٹ پہنا ہے
نہ بالی ہے نہ ہنسلی ہے نہ تن پہ کوئی گہنا ہے

سنہری چوڑیوں سے انتہا کی ہو گئی نفرت
پرانا طرز چھوڑا اور نئے فیشن سے کی رغبت

نہ سرمہ ہے نہ مسّی ہے نہ سر کی مانگ ہے سیدھی
جدھر دیکھا زمانے میں یہی رفتار ہے الٹی

کوئی دیکھو وہ اپنی جان ہی دیتا ہے فیشن پر
کوئی ہر قصے پہ ہنستا ہے کوئی خنداں ہے چلمن پر

چھری کانٹے سے کھانا میز پر تن تن کے کھاتی ہیں
بلا کر شوق سے غیروں کو پہلو میں بٹھاتی ہیں

حیا کہتی ہے میں دنیا میں اب برباد پھرتی ہوں
کوئی سنتا نہیں ہر ایک سے فریاد کرتی ہوں

نصیحت اب کوئی سنتا نہیں افسوس دنیا میں
تلاطم خیز یہ طوفان ہے فیشن کے دریا میں

"غالب ہندستانی ادب عالیہ کے چند اہم اور قابل قدر تخلیق کاروں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ہندستان کی اس شاعرانہ فکر کا نمائندہ ہے جس میں عجمی روایات کی قلم لگی ہے اور جس کی سادگی و پرکاری اور بے خودی و ہشیاری نے عالمی ادب کو اظہار اور اسلوب کے بہت سے بیش قیمت اور لائق تقلید نمونے دئیے ہیں۔ اسلئے غالب کے کلام کو بار بار پیش کر کے ہم عالمی ادب میں بلند ترین ہندستانی فکر شاعرانہ کے مکرّر اضافے کا مبارک کام انجام دیتے ہیں۔"

(امتیاز علی عرشی)

سیدہ اُمِ حبیبہ بانو
بی ایس سی (سال سوم)
نائب مدیرہ

غالب میری نظر میں

غالب اردو کے ایک عظیم شاعر گذرے ہیں۔ یہ اپنے زمانے میں بھی ستاروں میں چاند تھے، اور آج سو سال گذرنے کے بعد بھی ان کی شہرت کا چراغ برابر جل رہا ہے۔ روشنی دو چند ہے اور آج اس اردو دشمن زمانے میں بھی اردو کے اس عظیم شاعر کو یاد کیا جا رہا ہے۔ یہ غنیمت ہی نہیں بہت بڑی بات ہے

غالب کو اپنی فارسی دانی، فارسی دیوان اور نثر پر بڑا ناز تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے اردو کلام کو معمولی سمجھتے تھے۔ لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ اردو کلام ہی مقبول ہوا۔ فارسی نظم اور نثر اپنا منہ بسور کر کسی کونے میں بیٹھ رہے۔ اردو نثر کا بھی یہی حال رہا۔ غالب نے اردو میں کسی خاص موضوع پر کوئی تصنیف و تالیف نہیں کی۔ جہاں تک ان کے نثری سرمایہ کا تعلق ہے وہ صرف خطوط کی حد تک ہے۔ لیکن جو گل بوٹے خطوط نویسی کے میدان میں کھلائے ہیں اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی سمجھتے ہیں۔

"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا غالب ۔ اردو ۔ تاج محل۔

عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابوں میں ایک غالب کا دیوان بھی ہے۔ شاعری میں غالب کا اندازِ بیان واقعی بے مثال ہے اور انسانی کلام ہو کر بھی الہامی نظر آتا ہے

کہتے ہیں غالب قدرت کی طرف سے ایک موجدانہ اپج لے کر آئے تھے۔ ہم اس اپج کو اردو اور فارسی اور نظم و نثر دونوں میں پاتے ہیں۔ ان کے بیان و ادا میں ایک خاص رنگ ہے۔ وہ نقالی سے بچتے ہیں۔

تقلید سے دامن بچاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب نے بیدل کا طرز اپنایا اور ظہوری کا تخیل۔ خود غالب نے اعتراف کیا ہے کہ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے کی سعی کی مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ البتہ ظہوری کے تخیل کو بہت حد تک اپنا لیا۔

مرزا کے عہد شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے دور میں فارسیت کا رنگ ان کے کلام پر چڑھا ہوا ہے۔ مرزا بیدل کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ اس مشکل پسندی کی وجہ یار لوگ طنز کرتے۔ حکیم آغا جان عیش نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا

اگر اپنا کہا خود آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس کے جواب میں غالب فرماتے ہیں۔ ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دوسرے دور میں ان کے کلام میں انقلاب آگیا اور وہ رنگ اختیار کیا جو عام طور پر ہم ان کے دیوان میں دیکھتے ہیں۔ آخری دور میں کلام بہت ہی سہل ہو گیا۔ زبان کی صفائی اور بے ساختگی ایسے بڑھی کہ مانو آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عرصہ تک ان کے کلام کی قدر و منزلت نہ ہوئی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ان کا آسان سے آسان کلام بھی اس زمانے کے مذاق کے خلاف تھا۔ لیکن زمانے کی ترقی نے بتا دیا کہ غالب صحیح راستے پر تھے اور عظیم شاعر تھے۔

ان کے کلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہم اس میں ذوقِ فارسی اور ندرتِ بیان کو پاتے ہیں۔ عام اور مبتذل تشبیہیں ان کے کلام میں کہیں نہیں ملیں۔ نئی نئی تشبیہوں سے کام لیا ہے ملاحظہ ہو۔ سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے۔ گرداب کو شعلۂ جوالہ سے۔

جہاں تک الفاظ کے انتخاب کا سوال ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضمون کو ادا کرنا آپ کا خاصہ ہے۔ طرزِ ادا میں خاص جدت ہے۔ معمولی سے معمولی مضمون کو ندرتِ بیان کے جادو سے چار چاند لگا دیتے ہیں۔ غالب کے کلام میں حسن و عشق کو کافی دخل ہے۔ لیکن گل و بلبل کے بے مزا اور پھیکے افسانے کہیں نہیں ملتے۔ بلکہ انسانی فطرت کے عمیق ترین حقائق کے مرقع ہمیں ملتے ہیں۔ دنیا کی سطحی چیزوں سے مطمئن نہیں بلکہ ان کی حقیقت میں نظر گہری پہنچی ہے اور دور کی کوڑی لاتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے رموز کی ترجمانی غالب جیسے شاعر کے حصے ہی میں

تھی جو دوسروں کے نصیب نہ ہوئی۔ فلسفہ اور تصوف بھی ہم ان کی شاعری میں پاتے ہیں۔ وحدت الوجود کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے۔ شاعر کو ہر چیز میں ذاتِ باری تعالیٰ کا جلوہ ہی نظر آتا ہے۔ غالب کے سادہ سادہ اشعار میں بھی یہ خصوصیات ہمیں ملیں گی۔

غالب کا کلام بڑا پہلو دار ہوتا ہے۔ بادی النظر میں کسی شعر کے کچھ اور معنی اور مفہوم ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا غور و فکر کے بعد نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے شعر کا لطف کافی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں شوخی کو بھی دخل ہے۔ یہ شوخی دل میں تڑپ اور کیفیت پیدا کر دیتی ہے کلام میں سوز و گداز کو بھی پاتے ہیں۔ اس میں دل کی دردمندانہ کیفیت ملتی ہے آہ و بکا نہیں۔

ابتدا میں غالب فارسی کے شعراء میں بیدل اور ظہوری سے خاص طور پر متاثر تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ آپ نے اردو کے قدیم شعرا کا اسلوب ضرور اختیار کیا مگر آپ کی انفرادیت اپنی جگہ رہی۔ غالب کا خاص رنگ آپ کو ان اشعار میں ملے گا۔ ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

غالب نے جہاں شاعری کو چار چاند لگائے اور اسے آسمان پر پہنچایا وہاں اردو نثر کو بھی نیا طرز دیا۔ غالب کا خیال تھا کہ فسانۂ عجائب مختلف زبان سے خالی ہے۔ وہ تک بندی اور عبارت آرائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور میر امن دہلوی کی کتاب چار درویش کی زبان کو سراہتے ہوئے کہا تھا کہ چار درویش کی زبان ہی عمدہ زبان ہے۔ غالب ایک خط میں اصرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میری بات مانو تو اپنے خط کے بجائے رقعات عالمگیری یا انشائے خلیفہ سے جو عبارت پسند آئے لکھ لو۔ اور کسی اور کو لکھا کہ تم اردو کے متقبل ہو گئے ہو اور خط میں تحریر کرتے ہیں کہ ہمیں محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔

چار درویش عرف باغ و بہار کے مصنف میر امن تھے اور اسی محاورے سے لکھتے تھے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ غالب کا بھی یہی خیال تھا کہ خط لکھنا نہیں باتیں کرنی ہیں۔ نامہ نگاری نہیں مکالمہ ہے۔ لکھتے ہیں "میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے"۔

کہتے ہیں کہ جب نظم کا زوال ہوا تو مرزا کی نثر میں جیسے جان آ گئی۔ حالی فرماتے ہیں کہ غالب اپنے وصال سے پہلے ایک قصہ بھی لکھنا شروع کیا تھا۔ اسی سے نثر کی سہولیت، دوسرے یہ کہ نثر میں اجتماعی مسائل کے اظہار کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ چیزیں ہمارے یہاں غدر کی وجہ سے آئیں۔ پرانی قدروں کا قلع قمع ہوا اور نئے ادیب پیدا ہوگئے۔

غالب کے قلم سے نکلے ہوئے محاورے۔ فقرے اور ترکیبیں اکثر فارسی کے بطن سے نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن غالب اور ان کے معاصرین کی فارسیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک زبان کے مزاج کو بدل دیتی ہے۔ دوسری اس کی شکل کو مسخ کر دیتی ہے۔ ایک جگہ رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔ "وزیر مرغ زاغ، مطلعِ خیبت لعل نفس از مشرق سے جلوہ افروز ہوا۔ یعنی شب گذری روز ہوا" آخری جملے سے بات نکاتی ہے کہ مصنف بات کو بڑھا کر پیش کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ لیکن غالب کے ہاں اختصار زیادہ ہے۔ اردوئے معلیٰ کی ادبیت، مزاج اور ظرافت نے کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ آسان نثر کے موجد کی حیثیت سے میر امن کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی آسان طرز کا موجد غالب ہے۔

شیخ اکرام کے الفاظ میں یہ بات صحیح ہے کہ اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعہ دہلی سے وابستہ تھا۔

غالب کے ہاں اہم فن کی اہمیت کو زیادہ پانے لیا۔ اس کے برتنے کے لئے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں

غالب کے خطوط میں کسی قسم کی بے ربطی نہیں ہے۔ طوالت اور پروازِ خیال نہیں۔ تضاد بھی نہیں، اور نہ ابہام۔ اس نے جو کچھ محسوس کیا لکھا۔

غالب نے خطوط کے ذریعہ بڑے بڑے کام نکالے ہیں وہ لکھتے ہیں و ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا۔ زائد کو اور وقت کیلئے اٹھا رکھا۔ اسی معیار پر پہنچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے علاوہ غالب نے اپنی نثر یا خطوط میں حشو زوائد سے اجتناب کیا۔ اگر نثر میں واقفیت کا رنگ دیکھنا ہو ایک تمدن کا دوسرے تمدن پہ نخ پالنے۔ عورت کا تصور۔ بیوی اور طوائف سے پسے ہو کر محبوب کا تصور بن جانے اور جھوٹی شرافت کے پول کو کھلتے اور دوسری زبانوں کے الفاظ در آنے کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہو تو غالب کے خطوط کو پڑھنا چاہیے ان کے خطوط پڑھئے اور روزنامچہ کا لطف اٹھایئے

غالب کو شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے آپ نے پڑھ لیا۔ لیکن وہ نقاد بھی تھا اس نے تنقیدی ادب بھی چھوڑا ہے۔ غالب بحیثیت نقاد فن کار بھی ہے اور تنگ نظر نکتہ چیں بھی۔ قاطع برہان سے اس کی تنقیدی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے ہاں حسن اور اس میں ندرت بھی ہے۔ اختراع اور حسن بھی۔ اس کی تنقیدوں میں جامعیت، استدلال، اور وثوق کو بدرجۂ اتم پاتے ہیں۔

غالب اردو دنیا میں نقاد کی حیثیت سے باقی رہے گا اور نام پیدا کرے گا۔ شاعری اور خطوط اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس کا گزرا ہوا کل اپنی رنگینیوں اور اس کی عظمتوں کے باوجود شاندار نہ رہا۔ لیکن آج وہ پڑھا اور پوجا جا رہا ہے۔ اور آنے والا کل اردو کو ختم نہ کر دے تو وہ اور شاندار ہوگا۔

جناب خلیل احمد بیباک میسوری

قطعات

یاد تیری جب بھی آتی ہے
اشکِ خوں آنکھ سے رواں ہے
اور جب آنکھ بند کرتا ہوں
تیری تصویر مسکراتی ہے

صرف اک بار مسکرانے پہ
زندگانی نثار کرتا ہوں
میرے اشکوں سے پوچھ لے آ کے
کس قدر تجھ سے پیار کرتا ہوں

یک بیک سارے سہارے چھن گئے
گردش سے گویا ستارے چھن گئے
کی جو تجھ سے بیکراں کی آرزو
آئے دریا سے کنارے چھن گئے

ترے ظلم کا جو ہوگا وہ نشان بیچ دوں گا
جو کرے گی تیرا شکوہ وہ زباں بیچ دوں گا
ترے جور کے تصدق ترا ہر ستم گوارا
میں تری خوشی کی خاطر دل و جاں بیچ دوں گا

صفی ناز شاہدہ
یم اے (سال دوم)
میسور یونیورسٹی

غالب کا تصوّرِ حُسن

حُسن کی ماہیت کیا ہے ۔ ہستی میں حُسن کا کیا مقام ہے ۔ انسانی نفس سے انسانی حسن کا کیا تعلق ہے اور انسانی زندگی پر حُسن پسندی ۔ حسن پروری اور حسن افرینی کا کیا اثر پڑتا ہے ۔ یہ تمام بڑے گہرے سوالات ہیں ۔ حکیموں ۔ عارفوں ۔ شاعروں ۔ فنونِ لطیفہ کے ماہروں اور سائنسدانوں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے صورتِ انسانی میں بھی حُسن ہے ۔ آواز میں حُسن ہے ۔ رفتار میں حُسن ہے ۔ گفتار میں حسن ہے ۔ علم میں بھی ایک طرح کا حسن ہے اور عمل میں بھی ایک طرح کا حسن ہے ۔ افلاطون نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ زندگی کے انتہائی اقدار کیا ہیں ۔ تمام ہستی خیرِ برتر ہی سے صادر ہوئی اور اس کی طرف راجع ہوئی ہے ۔ اگرچہ یہ خیرِ برتر میں ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے ۔ لیکن اس وحدت کے تین پہلو ہیں ۔ حسن ۔ حق اور اخلاقی فضیلت ۔ یہ تینوں چونکہ ایک ہی وحدت کے تین پہلو ہیں اس لئے یہ ایک دوسرے کا آئینہ ہیں ۔ حق یا صداقت جب مظاہر میں ظاہر ہوگئے ہیں تو حسن بن جاتی ہے ۔ اور حسن بن کر روح کو اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ انگلستان کا مشہور شاعر کیٹس کہتا ہے حُسن حق ہے اور حق حُسن ۔ میں یہی جانتا ہوں اور اس کے سوا کچھ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ۔

حُسن آفرینی کے فنون کو فنونِ لطیفہ کہتے ہیں ۔ اس لئے کہ حُسن ایک لطیف شئے ہے فطرت کے مقابلہ میں حُسن آفرینی بھی ایک مستقل مقصد معلوم ہوتا ہے ۔ پھولوں میں جو رنگا رنگ کا حسن فطرت پیدا کرتی ہے ، ذوقِ حسن کے سوا اس کا مقصد اور کچھ نہیں ۔ جا بجا محسوس ہوتا ہے کہ حسن بذاتہٖ ایک مقصد ہے ۔ حسن انسانی کی فطرت کو ماہیت سے آشنا کراتا ہے ۔

غالبؔ اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں ۔ حُسن پسند اور حسن کار ہیں ۔ یہی ان کی زندگی کا سرمایہ ہے

غالب مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے ـــــ مغل جو جنگ جو اور بہادر ہونے کے باوجود لطیف چیزوں کے شیدائی تھے۔ حسن کا احساس اور آرٹ کا ذوق جن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ چنانچہ غالب کو بھی یہ باتیں ورثے میں ملیں۔ غالب کو بھی حُسن کا احساس ورثہ میں ملا تھا۔ وہ مرتے دم تک اس سے دل چسپی لیتے رہے۔ حُسن چاہے جہاں بھی ہو ان کو متاثر کرتا تھا۔ انسانی حسن، مظاہرات حُسن۔ فطرت کا حُسن۔ فن و ادب کا حُسن اور روحانی حسن ـــ غرض یہ کہ کسی جگہ کسی قسم کا ہو۔ وہ اس سے متاثر ہوتے تھے بہرحال ان کی نسل نے انہیں یہ دو چیزیں وراثت کے طور پہ دیں۔ ایک تو وجاہت اور ٹھے وٹے رہنے کا انداز اور دوسرا احساس حسن اور فن و ادب سے والہانہ وابستگی۔

غالب میں حسن پرستی کا احساس بڑا شدید تھا۔ یہ احساس کسی حد تک ان کی اپنی انفرادیت کا بھی نتیجہ کہا جاسکتا ہے لیکن اس میں ان کی نسل۔ خاندانی ماحول اور گرد و پیش کے اثرات کو بھی بہت دخل ہے۔ مغلوں کی روایتی حسن پرستی۔ امیرانہ ماحول کی تعیش پسندی اور بچپن کی لاأبالی اور آزاد زندگی نے اس احساس کی تشکیل کی اور اس کو غالب کے کردار کا جزو بنا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی اس کے اثرات خاصے نمایاں نظر آتے ہیں۔ غالب نے حسن کا تذکرہ جس خلوص اور رعنائی۔ جس آزادی اور بے باکی۔ جس سادگی اور صفائی کے ساتھ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس طرح وہ حسن کی ایک ایک بات کے بیان میں ڈوب ڈوب اور کھو کھو گئے ہیں۔ اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے اور حسن کا یہ شدید احساس ہی ان کے عشق کا محرک بنا۔

حُسن پرستی کا یہ شدید احساس غالب کو صنفِ لطیف کا شیدائی بنا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ حسن کی تان یہیں جاکر ٹوٹتی ہے۔ یوں تو غالب مناظرِ قدرت اور مظاہراتِ قدرت سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ انسانی زندگی کی معمولی سی معمولی بات بھی ان کے دل کو بھاتی ہے۔ شہروں اور عمارتوں پر بھی ان کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر میں ان کے دل چسپی کا باعث صنفِ لطیف کی ذات ہی ہوتی ہے۔ مثنوی "چراغ دیر" جو انہوں نے بنارس کی تعریف میں لکھی ہے اور کلکتہ کو خوب سراہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بنارس کے حسینوں کی تعریف کی ہے۔

غرض یہ کہ کسی نہ کسی صورت میں صنفِ نازک کے حسن و دل افروز سے اکتسابِ لذت کا جذبہ ان کے ہاں ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ "مہ رخوں کے لئے" "مصوری" سیکھتے ہیں تاکہ ملاقات کے لئے کوئی تقریب پیدا ہو۔ اور خوباں سے چھیڑ کو بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا وصل نصیب نہ ہونے کی صورت میں اس کی حسرت بھی انہیں عزیز ہے۔ حسن غالب کو مبہوت کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش میں حسن کی فراوانی اور اس کے جلوؤں کی بلاساماں دیکھتے ہیں تو حیران ہو کر پوچھنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

غالبؔ ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

حسن کا یہ شدید احساس غالب کے تخیل کی پرواز کو اس دنیا سے پرے لیجاتا ہے۔ وہ صرف اس دنیا کے لوگوں کے حسن کا احساس نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ آج سے صدیوں پہلے نہ جانے کتنے حسن پیدا ہوئے ہوں گے۔ زندگی ان کے حسن کی روشنی سے زرنگار ہوئی ہوگی۔ لیکن موت نے ان سب کو خاک میں ملا دیا۔ اور ان میں صرف چند کا حسن لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جو شاعر نہ صرف اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حسن کا احساس رکھتا ہو بلکہ جس کو دنیا میں پیدا ہونے والی بے شمار حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو جانے کے بعد لالہ و گل کی صورت میں نمایاں نظر آئیں۔ اس کے حسن پرستی کا کیا ٹھکانا۔ اس کو الفاظ کے پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ وہ ایک بحرِ بے پایاں ہے

غالب کے یہاں حسن پرستی بے مقصد نہیں ہے۔ وہ حسینوں کو صرف دیکھنے کے قائل نہیں بلکہ وہ ان کی محفلوں میں باریاب ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انہیں ان سے ملنے جلنے کی تمنا ہے۔ ان کے وصل کو وہ زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں لالہ عذارانِ سرو قامت کا پیار تماشائے "گلستان حیات" ہے۔

اسدؔ بہار تماشائے گلستانِ بہار
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

پس ان کی حسن پرستی کی تان یہیں جاکر ٹوٹتی ہے۔ ایک غالب پر ہی منحصر نہیں، ہر انسان کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں سی لیا کرتی ہے۔ دوسرے اس کو چھپاتے ہیں۔ غالبؔ اس خواہش کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور ان کی یہی خصوصیت انہیں حقیقت نگار اور واقعیت پرست بنا دیتی ہے۔

یوں تو یہ عام حسن پرستی غالب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اور اس کے شدید احساس نے مرتے دم تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن ان کی شاعری سے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں اس احساس کو انہوں نے ایک نقطے پر مرکوز کر لیا ہے۔ وہ کسی ایک ذات سے وابستہ بھی ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں اس عام حسن پرستی کے ساتھ ایک مخصوص ذات اور مخصوص شخصیت کی حسن پرستی بھی ملتی ہے۔ جس نے ان کے دل کو سب سے زیادہ لبھایا ہے۔ جس کے حسن نے ان کے دل میں روشنی کی ہے جس کی اداؤں نے انہیں مسحور کیا ہے۔

از
عظمت النساء جہاں
بی اے۔ (سال دوم)

غالبؔ کی شاعری میں عشق کا تصوّر

ایک مغربی مصنف لیون گازلان LEON GAZLAN کا یہ قول کہ "دنیا میں عشق ہی سب کچھ ہے وہ تو خدا ہے" اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس جذبۂ انسانی کو زندگی میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اور اس خیال کے صحیح خدوخال اس وقت بے نقاب ہوتے ہیں جب اس حقیقت کو دنیا کی تمام شاعری ثابت کرتی ہے۔ کہ ان میں جذبۂ عشق کی ترجمانی کا پلہ دوسرے تمام موضوعات پر بھاری ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ اس طرح چھایا رہے گا۔ اس جذبہ نے فن وادب کی تخلیق کرنے والوں کے افکار وخیالات کے شہ پروں پر سوار ہو کر نئی نئی زمین کی سیر کی ہے۔ انجان گھاٹیوں۔ سرسبز مقاموں۔ کوہساروں اور ویرانوں میں بسیرا کیا ہے۔ ان دیکھے آسمانوں پر پرواز کی ہے۔ غرض یہ ہے کہ حالات و واقعات اور فضا و ماحول کے تقاضوں سے یہ جذبہ ہر ملک اور ہر قوم میں ہے اور ہر عہد اور ہر زمانے میں مختلف روپ دھار کے دنیا کے سامنے آتا رہا ہے اور آتا رہے گا۔ دوسرے ممالک کے (مغربی ممالک مراد ہے) شعروادب کی طرح اردو شاعری میں بھی جذبۂ عشق کی ترجمانی کا پلہ دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں بھاری نظر آتا ہے۔ ساری اردو شاعری اسی سے عبارت ہے۔ ہر دور کے شاعر اسی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر طبع آزمائی کی ہے۔ سماجی حالات کے ساتھ ساتھ شاعروں کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحانات نے بھی عشق کے تصورات کو مختلف سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ گویا اردو شاعری سماجی حالات کے زیر اثر بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کی تاریخ ہے۔ پرتو ہے۔ جس میں کہیں گل وبلبل کے پردے میں مشرقی عشق کے روایتی تصورات کا بیان آئینہ ہے۔ کہیں قیس و فرہاد اور لیلیٰ و شیریں کے پردے میں جذبۂ عشق کی شدت کا تذکرہ جس نے اکثر قوموں کو کھا کر چھوڑا ہے غرض اردو شاعری عشق کے ان تمام تصورات سے ان تمام نظریات اور ان تمام باتوں سے بھری پڑی ہے اور ان سب کے رنگارنگ اور بوقلموں کا ایک گلدستہ ہے۔

دل اور نظر شاعری کے دو اہم عناصر ہیں جن سے شعر وسخن کی تعمیر ہوئی ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں دل کو حیات اور نظر کو کائنات کے لفظوں سے موسوم کیا گیا ہے۔ حیات و کائنات سے ہی دراصل شعر کا موضوع اور محرکات ہیں لیکن ہمارے شعراء دل و نظر حیات و کائنات کو دو نہایت لطیف اور دل نشین الفاظوں میں یاد کیا اور وہ ہی حسن وعشق۔ ایک آدمی حُسن کو دیکھکر اپنے دل کی بھڑاس اشعار کے وزن پر نکال لیتا ہے۔ لیکن جب ایک شاعر کی نظر اس پر پڑتی ہے تو اس کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یعنی اس کا اثر اُس کے قلب پر ہوتا ہے۔ جس کو مجبوراً لے اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔

حسن وعشق کو ہم یہاں بطور ایک ملی جلی حقیقت کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک

اسی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے جہاں حسن ہو وہاں عشق نظر آتا ہے۔

شوخیٔ حسن عشق ہے آئینہ دار ہم دگر ؎ خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا سمجھ

حسن گو ایک بیرونی حقیقت ہے۔ یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور عشق کی اس بیرونی حقیقت سے ذہن کا تعلق ہوتا ہے۔ جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔

غالب کی عشقیہ شاعری بھی اردو شاعری میں آئے ہوئے انہیں عشقیہ تصورات میں سے ایک مخصوص تصور کی ترجمانی کرتی ہے جس نے خود غالب کی زندگی میں مختلف کروٹیں لیں۔ اور اس طرح مختلف روپ میں اپنے آپ کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ غالب نے عشق کا ایک مخصوص تصور پیش کیا ہے کہیں ان کے یہاں عشق کا وہ روایتی تصور ملتا ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں عام تصور ہے جس میں وہ ایک صحت مند انسان کی طرح عشق کی جنسی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب "پرستش" کی جگہ "خواہش" ان کے نزدیک زیادہ اہم ہو جاتی ہے اور کہیں تصوف کی دنیا میں پہنچ کر عشق کی حقیقت و معرفت سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

غالب کی شاعری اِن روایات کے سائے میں آنکھ کھولی۔ اس لئے ابتدائی زمانے کی شاعری (یعنی ایرانی شاعری کے تاثرات فارسی شاعری میں صدیوں سے چلے آرہے تھے) میں ان کے یہاں بھی اِس روایتی عشق کے تصورات ملتے ہیں۔ روایتی ماحول میں انہوں نے پرورش پائی تھی چنانچہ اپنی شاعری کے زمانے میں وہ فارسی کے بعض ایسے شاعروں سے شعوری طور پر متاثر ہوئے ہیں جن کی شاعری روایتی رنگ میں رنگی ہوئی تھی مثال کے طور پر ابتدائی زمانے میں بیدل کے اثرات ان پر خاصے گہرے نظر آتے ہیں اور ان اثرات کو انہوں نے شعوری طور پر قبول کیا ہے۔ لیکن اس کے تھوڑے دنوں بعد انہوں نے بیدل اور دوسرے شاعروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خود اپنے آپ کو اور اپنی شخصیت کو غالب کر لیا۔

غالب نے حسن کی تصویر کسی تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں کی۔

۱۸۲۷-۲۸ء میں کلکتے جاتے ہوئے غالب کو بنارس میں قیام کا موقع ملا اور یہاں کی نسوانی حسن و جمال نے انہیں بے تاب کر دیا۔ کوچہ و بازار، در و بام، کنار دریا جدھر نظر اٹھتی شاعر کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ مثنوی "چراغ دیر" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ مسلسل نظم اور پھر عورت کے حسن کا پرجوش بیان جزئیات حسن و جمال کی مرقع نگاری کی تقریب اگر ہو سکتی تھی تو یہ تھی لیکن غالب کا تخیل حسن و جمال کے اس جمگھٹے کے قریب آکر [illegible] کچھ تاثرات، کچھ جذبات لیتا ہے اور کہیں دور نکل جاتا ہے۔

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور ؎ سراپا نور ایزد! چشم بد دور!

تبسم بسکہ در لب ہا طبیعی ست :: دہن بارشکِ گل ہا ہائے در بیعی ست

یہ اشعار حسینانِ بنارس کی تصویر پیش نہیں کرتے۔ لیکن سرور و اضطراب کی اُس کیفیت سے بسریز ہیں۔ جو اِس حسن و نظارے سے، غالب کے دل پہ طاری ہوئی۔ دراصل غالب کو حُسن کی تصویر سے نہیں۔ اس کی تاثیر سے سروکار ہے۔ جہاں کہیں اسے حسن کی مصوری مقصود ہے وہاں حرف اشارات سے کام لیا ہے۔ اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ۔ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو؟

کہاں ہمارے تصور کو کلام میں لانا چاہیئے کہ آئینہ میں دیکھتے ہوئے اس شوخ سنگ پارہ حسن کے خدوخال کی نقشبندی کرے ۔۔۔۔۔۔ شاعر نے ہمیں دوسرے شعر میں ہماری رہنمائی کرکے آگاہ کیا ہے کہ شہر بھر میں اس چہرے کی مثال نہیں ہے اور کبھی ہمیں پیکرِ حُسن کی بیرونی حاشیے کی جھلک ہم کو دکھائی جاتی ہے۔ یعنی وہ پیکر کیا ہے اس کا حاشیہ کیا ہے وغیرہ اس میں تخیل کا امتحان ہو جاتا ہے۔

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں۔ ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالب کی تخیل کا عکس جو اس زمانے میں ایک کیفیت خاص رکھتا ہے اس کے بعد بھی توجہ کو بدستور دعوتِ نظر دیتا ہے۔ یعنی قامتِ یار کی رعنائی ہے

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجائے۔ کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

شاعر کے ذوقِ نگاہ میں "قد و رخ" کی لطافت کا یہ امتزاج عنفوانِ شباب کی منزلوں میں بھی قائم رہا لیکن اس سے قطع نظر حسن و قامت کو بجائے تخیل میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔

پورے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بدن، لچک اور موسیقیت یعنی پورے پیکر کی شوخی رعنائی پر غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے۔

ہے ساعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم :: آنا ہی سمجھ میری آتا نہیں گو آئے

یعنی بجلی، شعلہ اور پارے کا عالم کو اس پیکرِ حُسن کے آنے کو خطاب کرتے ہیں۔

جو غنچہ جوشِ صفائے تنش زبالیدن :: دریدہ برتنِ نازک قبائے تنگش را

"جوش صفائے تنگ" تن " کے بعد ہیں غالب جوش صفائے زلف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ " قد و گیسو" کا ساتھ غالب کی شاعری میں جوانی کے دنوں میں شروع ہوا اور تا عمر قائم رہا۔ اس پیکرِ حُسن کے سیاہ لمبے بالوں کی چمک غالب کی شاعری کے ہر دور پر غالب ہے کہ سرسری مطالعہ کرتے ہوئے بھی ہمیں اس کی جھلکیاں بار بار سامنے آتی ہیں۔ غالب کی نوجوانی کے اس مصرع سے ملاحظہ فرمائیے جو پوری زندگی فریاد سے لرز رہا ہے۔

ع کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ے زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار ۔ یارب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو

اس شعر میں زلف کا تصور ایک نئی تشبیہ کا سرمایہ بنایا ہے۔ لیکن زلف کے حسینی وجود شاعر کے حواس سے کبھی دور نہیں ہوتا۔

ع ابھی آتی ہے بو بالش کی اس کی زلف مشکیں سے

غالب کے لئے جو تین عناصرِ حسن بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اُن میں سے تیسرے اور سب سے بڑے جزو کا ذکر اس نے مستقبل کے مصرع میں کردیا۔

ع نگہ چشم سرمہ سا کہ ہے ۔

اس شعر میں زلف نگاہ کا ربط اتفاقی نہیں ہے بلکہ غالب کے تصورِ حُسن کی ایک گہری خصوصیت پر مبنی ہے۔ قد و گیسو کے باہمی تاثیر کی طرح اس کے تخیل میں زلف بھی نگاہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لطافت اعضا اتوا میں صفائے زلف کا عکس ہے۔ حلقۂ زلف میں شوخیٔ نگاہ کی جھلک ہے اور پھر اس سے آگے نگاہ کی تیزی میں شعاع آدا زہے۔ چنانچہ دورِ اول کے ایک پر لطف شعر میں زلف نگاہ کا باہمی رشتہ اس طرح قائم ہے

ے حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل ۔ ہر تارِ دل کو نگہ سرمہ سا کہوں ۔

یعنی تیری زلفوں کے جتنے بھی پیچ ہیں۔ سب میرے دل کے پھانسنے کے درپے ہیں اور بڑی توجہ سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ چونکہ تیری سرگیں نظریں بھی یہی کام کرتی ہیں اس لئے اگر میں تیری زلف کے ہر تار کو نگاہ سرمہ سا کہوں تو بے جا نہ ہوگا لیکن ابتدائی زمانے میں یہی آنکھیں کسی اور رنگ میں بھی غالب کے سامنے آتی ہیں اس زمانے کا لکھا ہوا یہ شعر ایک حسین و جمیل مرقع ہے ۔

ے نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی
دیا ابرو کو چھیڑا اور اس نے فتنے کو اشارت کی

غالب نے چشم و نظر کے موضوع پہ وہ رنگ برنگ مضمون پیدا کئے ہیں کہ ایک فرگان کی شاعری کا ہی کو لیجئے۔ یہ غالب کے عشقیہ کلام کا ایک مستقل باب ہے۔ بے باک نظروں کی چھبن کے بیان میں بزمِ حسن کا یہ ترنگا انسانی نقشہ ذرا اپنے تصور میں ملاحظہ کیجئے۔

ے تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز ۔ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

اے معشوقہ! غیر پر تیری محبت کی تیز تیز نگاہیں پڑ رہی ہیں اور تیرے دل میں گھر کر لینے والی لمبی لمبی پلکیں مجھے رشک و حسد سے آزردہ کر رہی ہیں۔ اس کے برعکس نسوانی حیا کی اس حسین تصویر کو دیکھئے جس میں یہی درازیٔ مژگاں، ایک ادائے شرم کو آب و رنگ دے رہی ہیں۔ جھکی جھکی آنکھوں کی نگاہیں

زمین پر جمی ہوئی ہیں جس سے پلکوں کی دلفریبی کچھ اور نمایاں ہوگئی ہے۔ شاعر نے پر لطف انداز میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ اس کی نظریں آنکھوں سے باہر آنے کے لئے بیتاب ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ لمبی پلکوں سے پوری نہیں اتر سکیں۔ ؎

نہ از شرم است کز چشم دے آساں بر نمی آید
نگاہش باو رازی ہائے مژگاں بر نمی آید

اور اس کے منہ پر نقاب انہیں کچھ اور کھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ نقاب کا کام چہرہ کو چھپانا ہے لیکن وہ معشوقہ کی نقاب پوشی میں بھی ایک انداز دلبری و طرز دلربائی دیکھتے ہیں یعنی چہرے پر نقاب ہونے کے باوجود اس کے حسن کا عالم وہ عالم ہے کہ ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے چہرے پر نقاب زلفوں سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے ؎

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کے دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

اور جب وہ سامنے آتا ہے تو ایک بجلی سی کوندجاتی ہے لیکن اس کے سیماب وشی اور برق سامانی اتنا موقع کہاں دیتی ہے کہ کوئی اس سے بات کر سکے یا اپنی ذرا سی جھلک دکھائی اور غائب ہوگئے ؎

بجلی ایک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس کی انگشت حنائی کا خیال کبھی ان کے دل محو نہیں ہوتا اور اس کا تصور ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ یعنی تیری انگشت حنائی کے خیال میرے دل سے مٹنا گوشت سے ناخن کے جدا ہو جانے کی طرح ناممکن ہے ؎

دل سے مٹنا تیری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اور معشوق کے لبوں کی مٹھاس کے خیال میں ٹھکانا نہیں۔ یعنی اس کے لبوں کی مٹھاس بھی عجیب شئے ہے تو نے رقیب کو گالیاں دیں اور گالیاں حالانکہ تلخ ہوتی ہیں۔ لیکن تیرے لبوں کی شیرینی کے طفیل رقیب گالیاں کھا کر بھی بے مزا نہیں ہوا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب ؎
گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوا

اور کبھی کبھی اپنے معشوق کے ہونٹوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ جب تو شراب کا جام اپنے ہونٹوں تک لے جاتا ہے تو شراب جیسی رنگین چیز خود تیرے ہونٹوں سے اخذ رنگ کرتی ہے اور جام شراب کا خط ایک گلچیں کی طرح

سمِ بہار اور کیف آفریں ہونٹوں کو دیکھتا ہے ۔

کرے ہے بادہ تیرے لب سے کسبِ رنگ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

معشوق کا دہن ان کے نزدیک غنچۂ ناشگفتہ ہے اور انہیں بوسہ لینے کی خواہش ہے چنانچہ یوں کہتے ہیں کہ میرے اس سوال کے جواب کہ بوسہ کس طرح لیا جاتا ہے تو نے دور سے ناشگفتہ کلی ہونٹوں کے قریب لاکر دکھا دی اس سے میں کچھ نہیں سمجھا۔ منہ سے میرا بوسہ لے کر بوسہ لینے کا طریقہ بتا

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے۔ ان پر اپنے گرد و پیش کے اثرات بھی پڑتے تھے مروجہ روایات اور اخلاقی اقدار سے بھی ان کا پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ لیکن ان کی شخصیت میں دورنگی کی خصوصیت نام کو نہیں تھی۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے بغیر چھپائے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ چنانچہ انکی عشقیہ شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے جو کچھ جذبۂ عشق کے متعلق سوچا اس کا اظہار بغیر کسی جھجک کے کر دیا ہے وہ جنسی نظریۂ عشق کے قائل تھے وہ اس بات کا اپنے شعروں میں احساس دلاتے ہیں کہ عشق کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ اس کی تکلیفوں کے باوجود اس کے وجود کو زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں بغیر اس کے عمر کٹ نہیں سکتی ۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

انہیں یہ بات تسلیم ہے کہ عشق پر کسی کا زور نہیں۔ اس دنیا میں آکر انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے غالب! عشق پر زور نہیں چل سکتا یہ تو وہ آگ ہے جسے محبوب کے دل میں روشن کرنا چاہیں تو کر نہیں سکتے اور اپنے دل میں سرد کرنا چاہیں تو سرد نہیں کر سکتے ۔

عشق پر زور نہیں ہے وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

غالب کی عشقیہ شاعری میں انانیت و خود پرستی کا اثر زیادہ تر پایا جاتا ہے ۔ بہرحال ان کے عشق کا یہ تصور ایک مخصوص تصور ہے ۔ اس میں جذباتیت سے زیادہ عقلیت ہے روحانیت سے زیادہ مادیت ہے۔ رومانیت کے بجائے حقیقت ہے ۔ افلاطونیت کے بجائے جنسیت ہے۔ انکی مادیت اور جنسیت، خود پرستی اور انانیت دوسروں کو زیر اور اپنے آپکو زبر رکھنے کی خواہش عیش و نشاط کی تلاش اور لذت کے شدید احساس کے ہاتھوں پیدا ہوئی ہے ۔ یہی ان کے تصوراتِ عشق کے محرکات ہیں ۔

غرض اردو ادب میں غالب کی عشقیہ شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں عشق کا انسانی تصور ملتا ہے ان کے تمام خیالات تمام واردات و کیفیات اور تمام جذبات و احساسات انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ اور انہیں خصوصیات نے غالب کی عشقیہ شاعری میں رس بھرا ہے اور رنگینی پیدا کی ہے۔ اور خود غالب اپنے کلام میں شورش کا اعتراف کرتے ہیں۔

ع

لکھتا ہوں اسدؔ شورشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پر انگشت

(بقیہ غالب کا تصورِ حسن)

غالب نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہیں کی ہے۔ نہ کہیں اس قسم کا سراپا باندھا ہے جیسے میرحسن یا جرأت یا بعض انگریزی شاعروں کے کلام میں مل سکتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن میں شاعر نے —

زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے۔

کی حد تک صراحت سے کام لیا ہے۔ بحیثیت مجموعی دیوان اور کلیات میں جن کی مصوری اسی تشبیہ کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔

روایتی تشبیہ سے بھی غالب نے کام لیا ہے۔ لیکن تشبیہ فی نفسہ ان کے لئے باعثِ کشش نہیں۔ بالعموم اس کا استعمال ضمنی ہے اس کی ہلکی سی بنیاد پہ وہ کسی لطیف نکتے کی تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن پیکرِ حسن کی وہ مفصل عکاسی جو روایتی سراپا سے مخصوص ہے غالب میں کہیں نہیں ملتی۔ جہاں کہیں حسن کی مصوری مقصود ہے وہاں انہوں نے صرف اشارات سے کام لیا ہے اور کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

معشوق کی نگاہِ ناز ان کے دل پہ اثر کرتی ہے۔ لیکن وہ اس کی خلش میں ایک لذت محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس خلش کی محرک معشوق کی نگاہِ ناز ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

وہ سامنے آتا ہے تو بجلی کوند جاتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۹۲ پر

ساجدہ خانم ایم اے (سال اول)
میسور یونیورسٹی

غالب شوخی و ظرافت کے آئینہ میں

آسکر وائلڈ نے ظرافت کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "کہ اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دے دو ظرافت ایسی ہی ایک نقاب ہے فرائڈ نے اسے SENSE IN NONSENSE کہا ہے یعنی بے تکی بات میں تک کی بات

فارسی میں ظرافت کے لغوی معنے دانائی اور خوش طبعی کے ہیں مگر اردو میں لفظ ظرافت بڑے وسیع معنے میں استعمال ہوتا ہے اس کے تحت... ہزل، پھکڑ، فحاشی، ضلع جگت، فقرے بازی، پھبتی، لطیفہ، تمسخر وغیرہ سب ہی چیزیں آجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ایک لفظ HUMOUR ہے جسے اردو میں مزاح کہتے ہیں اور اس مزاح ہی میں ایک چیز طنز ہے اور طنز سے بڑی حد تک ملتی جلتی چیز لغز ہے جسے انگریزی میں WIT کہتے ہیں WIT بھی ایک طرح کا طنز ہے مگر یہ طنز سے ہلکے درجے کی چیز ہے اس کے بعد اردو میں ہجو اور ریختی خمریات بھی اسی مزاح کے تحت آتی ہے

مزاح ظرافت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ برگساں کا کہنا ہے کہ مزاح کی اپیل براہ راست ذہانت سے ہے مزاح نگار صرف تماشائی نہیں ہوتا بلکہ مبتلائے تماشا بھی ہوتا ہے۔ ہر مزاح قہقہہ پیدا کرنے کی اہلیت تو ضرور رکھتا ہے مگر اس کا خاص تعلق ہمدردی (SYMPATHY) سے ہے یعنی مزاح ایک بات یا ایک فقرے میں نہیں ہوتا بلکہ ایک مکمل بیان تاثر ہمدردی کا جذبہ طاری کرتا ہے۔

دراصل ہنسی جس سے ظرافت کے پودے کی آبیاری ہوتی ہے ایک فطری جذبہ ہے جو مخصوص لمحات زندگی میں ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ ذی روح چیزوں میں صرف انسان ہی ایک ایسا حیوان ہے جو ہنستا ہے

اردو ادب میں ظرافت کا آغاز بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے نظم ہی سے ہوا اور عروسِ ادب کے گلے میں سب سے پہلے شوخی اور شگفتگی کی مالا شاید نظم ہی نے ڈالی۔ طنز و مزاح کا آفتاب سب سے پہلے یونان کے افق سے طلوع ہوا اگر تاریخی حیثیت سے اردو نثر و نظم میں طنز و ظرافت کا تجزیہ کیا جائے تو ہم پورے ادب کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں اردو کا پہلا دور جعفر زٹلی سے شروع ہو کر سودا پر ختم ہوتا ہے جس میں سودا اپنے دور کے مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ دوسرا دور جو غدر کے بعد تک کا دور ہے اس میں نثر و نظم میں شوخی و ظرافت کی دستار اسد اللہ خاں غالب کے چہرے پر

بھی لگتی ہے۔ تیسرا دور اکبرالہ آبادی سے شروع ہوتا ہے۔ چوتھا دور جس میں دور حاضر بھی شامل ہے اور جسے قدیم وجدید کے درمیان کی کڑی کہنا چاہیے۔

غالب کی نثر و نظم دونوں میں شوخی، طنز اور ظرافت کے پھول کھلے ملتے ہیں۔ گوئٹے کا کہنا ہے کہ "صاحب فہم کے لئے دنیا کی ہر چیز مضحکہ خیز ہے لیکن علل واسباب کے پابند افراد کے لئے کوئی چیز بھی ایسی نہیں" دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ فہم اور اعلیٰ ظرافت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک بلند پایہ ظرافت نگار بننے کے لئے پہلی شرط یہ بھی ہے کہ وہ شوخ طبع ہی نہیں بلکہ فہم اور نکتہ سنج بھی ہو۔ غالب شوخ طبع بھی تھے اور نکتہ سنج بھی تھے۔ مگر ان میں شوخی کا عنصر زیادہ تھا۔

غالب کے کلام میں شوخی و ظرافت و مزاح ہے اس کے پیش نظر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ "اردو شعر و ادب میں ہی نہیں بلکہ طنز و ظرافت کی محفل میں غالب اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے والے کا کوئی استاد وارد ہو جائے"

یہ واقع ہے کہ غالب کے کلام میں جو شوخی و ظرافت ہم کو ملتی ہے وہ ان کے ماقبل کے تمام شعرا یا خود ان کے ہمعصروں یا ان کے بعد کے شعرا سے بالکل مختلف ہے۔ ولی اورنگ آبادی سے لیکر غالب تک اردو کے جتنے سنجیدہ شعراء گذرے ہیں ان سب کے کلام میں کم و بیش اگرچہ انبساطی رنگ پایا جاتا ہے لیکن ان کے ظریفانہ اشعار پڑھ کر طبیعت میں ایک طرح کی گدگدی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر اس مسکراہٹ کے بعد ہم کو فکر کا کوئی میدان نہیں ملتا۔ ہم کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو مسکرانے کے بعد دعوتِ فکر دے۔ ان کی ظرافت یا تو ہنسی کو پیدا کرنے والی ظرافت ہوتی ہے یا تو اس میں اتنی تلخی ہوتی ہے جو مذمت یا ہجو کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ ان کا مقصد محض طبیعت کے بار کو ہلکا کرنا اور واہ کا موقع اور ہنسنے کی دعوت دینے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

مگر غالب کے مزاج میں ایک انفرادیت ہے ان کے ہاں نہ تو اپنے ماقبل شعرا کی طرح افراط و تفریط کی بدسلیقگی اور بھونڈا پن ہے اور نہ ہلکا پھلکا ٹھٹھول۔ انہوں نے شعر میں شوخی پیدا کرنے کے انوکھے انداز وضع اختیار کئے ہیں کبھی وہ اپنے اندازِ بیان سے شوخی اور مزاح پیدا کرتے ہیں تو کبھی ایک نت نئے اندازِ تخیل سے انکی فکر بلند سے شوخی کی نئی نئی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان کے تینوں اندازیں بھی ایک سنجیدہ مسکراہٹ ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری "زندگی کی خارجی کیفیات کا موازنہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندورنی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان کی شوخی ایک معنی خیز تبسم ہے۔

غالب براہِ راست طنز نہیں کرتے بلکہ اپنے اندازِ بیان میں ایک ایسا نکھار پیدا کر دیتے ہیں کہ گھوم گھام کر نشانہ وہیں پڑتا ہے جہاں وہ چاہتے ہیں عاشق و معشوق، زاہد و واعظ تک ان کا طرز محدود نہیں رہتا بلکہ اگر کہیں خضر اس کا نشانہ بنتے ہیں تو کہیں خود انکی ذات۔ اس سلسلے میں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

غالب کی زندگی کنگ لیئر کا سا المیہ ہے مگر المیہ کے ہر اہم موقع پر حیوانِ ظریف کی فطرت بھی جھکتی نظر آتی ہے
وبا ضرور ایک المیہ ہے۔ ایک المناک مناظر غالب کے سامنے ضرور ہونگے مگر اس کے بابت وہ کیا لکھتے ہیں۔

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ[۶۶] برس کا مرد اور ایک چوسٹھ برس کی عورت۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی مرتا تو ہم جانتے کہ وبا تھی۔

امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کا انتقال ضرور المناک تھا مگر غالب اس پر لکھتے ہیں " امراؤ سنگھ کے حال پر اس واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

غدر سا المیہ شاید کوئی اور غالب کے سامنے گزرا ہو چنانچہ جب دلی کے مکانوں کو ڈھایا جاتا ہے تو اس دردناک منظر کو دیکھ کر میر مہدی کی آنکھیں دکھنے لگتی ہیں تو مزاح کا رنگ یوں پھوٹتا ہے

" تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکالیں جتنی گرد اڑی اس کو آپ نے ازراہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی "

غالب کا ادراک بھی آفاقی ہے جس میں دردناک سے دردناک بات کے پس منظر میں بھی ایک تشگفتگی ہے جو درد کے پیچھے ایک عجیب دائمی مسکراہٹ کو چھپا ہوا دکھاتی ہے اور تمام تکلیف دہ صورتوں کو بھی ایک آفاقی ہمدردی کی سطح پر نقش و نگار کی طرح دکھاتی ہیں۔ ناامیدی کا اس سے بہتر اظہار اور کیا ہو سکتا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

مگر اس شعر کو جتنا پڑھتے جائیے اتنی ہی ناامیدی دور ہوتی جاتی ہے ایک عجیب تسکین کا عالم طاری ہوتا جاتا ہے اپنے ایک اور شعر میں غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ...

اعلیٰ ترین مزاح ایک عجیب قسم کی ہمدردی کا نام ہے۔ جو مزاح نگار کو ہمارے قریب ترین دوست بنا دیتی ہے شیکسپیئر کی طرح غالب بھی ہمارے قریب ترین مخلص دوست ہو جاتے ہیں ہماری زندگی کے ہر قدم پر اور ہر موقع پر ان کے

شعر ہمارے سامنے آتے ہیں جو ہمارے لئے تسکین کا آخری پشت پناہ ہے۔ مرزا غالب اپنے انداز مزاح میں فرماتے ہیں۔

زندگی جب اپنی اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مزاحیہ حالت کے نقشہ دیکھئے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھے میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

یہاں جنت کے اہم مسئلے کچھ بھی وہ مزاح سے حاصل کرتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ان کے سنجیدہ سے سنجیدہ اشعار اور غزلیں المیہ کے ساتھ طربیہ کا ویسا ہی جبن مزاح پیش کرتے ہیں۔

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب سے پہلے سودا بھی تھے جن کی ہجوئیں مزاح نگاری کے دائرے میں لائی جا سکتی ہیں اور ریسرچ کرنے والے نہ معلوم کتنے اور مزاح نگار ڈھونڈ نکالیں گے مگر غالب اردو ادب میں پہلے شخص ہیں جن کی نظرت کا اور زندگی کا اہم جزو مزاح ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جو ہم سے اتنی ہمدردی رکھتا ہو جتنی غالب یا جس سے ہم اتنی ہمدردی کرتے ہوں جتنی غالب سے۔

وہ ایسا عزیز ساتھی ہے جو سب سے ہمدردی رکھتا ہے اور یہی ہمدردی مزاح کی جان ہے۔ اسی کی بنا پر وہ ہمارے تمام ادیبوں میں مقبول ترین ہیں۔ وہ جلد سے درجے پر اتر آتے ہیں اور ہمیں اپنے درجے پر اٹھا لیتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غالب ہمیں مفت ہاتھ آجاتے ہیں یہی حیوان ظریف اور مکمل حیوان ظریف کی فطرت ہے۔

عظیمہ اصغری خاتون
بی اے (سالِ اول)

بلائے جان ہے غالب

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ہر عمارت کو دیکھ کر اس کے معمار کے متعلق اور ہر تصویر کو دیکھ کر ہم اس کے مصور کے بارے میں - ہر تحریر کو دیکھ کر اس کے محرر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کسی شاعر کا صحیح عکاسی اس کا کلام ہوتا ہے۔ اور غالب کا دیوان تو ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے - دلی کے شعرائے متاخرین میں سب سے زیادہ قابلِ فخر اور سب سے زیادہ قابلِ ذکر کسی شاعر کی اگر ہستی ہے تو صرف مرزا غالب کی ہی ہستی ہے۔ ان کا کلام وحی نہیں ہے ان کے اشعار الہام نہیں ہیں۔ ان کا دیوان کتاب آسمانی نہیں ہے۔ اُن کے اجزائے کلام منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں وہ کچھ ہے جسے سب کچھ کہتے ہیں -

غالب کے زمانے میں نہایت مشہور و معروف ہستیاں بھی تھیں جنہیں ذوقؔ - مومنؔ - آزردہؔ - شیفتہؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قدیم تشبیہات پامال اور فرسودہ خیالات سے نہ ذوقؔ کا کلام پاک ہوتا تھا نہ مومنؔ کا - اور سچ تو یہ ہے کہ مرزا غالب بھی بڑی مشکل سے اس دشوار گزار وادی کے کانٹوں سے اپنا دامن بچا سکے اور اس پر بھی کہیں کہیں انہیں بھی کسی نہ کسی کانٹے سے الجھنا ہی پڑا۔ اور خود کہتے ہیں۔ غزل کا دامن انہیں تنگ معلوم ہوا اور انہوں نے یوں کہا کہ ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر چونکہ طبیعت غزل کی طرف راغب تھی۔ اس لئے کسی اور موضوع کو اپنا نہ سکے اور انہوں نے غزل کی تنگی کے باوجود اس میں ہر قسم کے موضوع کو سمو دیا۔ مگر اس کے باوجود غزل ہر دور میں مقبول رہی - ان کی غزل ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ چونکہ دل سے جو بات نکلتی ہے وہ بہت اثر رکھتی ہے اور اس لئے ان کی غزل میں تاثیر ہوا کرتی تھی۔ کسی انگریز نے کہا ہے۔ ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جن میں سب سے زیادہ غم

انگیز خیالات کو پیش کیا گیا ہے ۔ غالب کی غزل میں حسن و عشق ہی نہیں بلکہ ان کی غزلوں میں فلسفہ تصوف اور اخلاق کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں ۔

ع
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب کی اسی سادگی نے ان کو ہمہ گیر شہرت عطا کی ۔ ویسے مومن کا پایہ بہت بلند ہے لیکن ان کے یہاں پیچیدگی اتنی ہے کہ ہر شخص ان کی غزلوں کو نہیں سمجھ سکتا ۔ یعنی وہ ہمارے جھو نپڑے میں آئے یہ قدرت الٰہی ہے اس وجہ سے حالت حیرانی میں کبھی ہم انکو دیکھتے ہیں اور کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں ۔ "یہ منہ اور مسور کی دال" مصرعہ ثانی اس قدر بے تکلف واقع ہوا ہے کہ اس سے زیادہ سلیس کر کے لکھنا غیر ممکن ہے یعنی کلام سادہ اور سلیس ہے بندش چست ہے ۔ شوخی اور ظرافت نمایاں ہے ۔ حسن بیان اور لطیفہ زبان سے خالی نہیں ۔

غالب کی اور خصوصیت جس نے ان کے اشعار میں ایک نئے پہلو سے نشتریت پیدا کی ہے ۔ ان کی شوخی نگاہ ہے جس سے ہم میر کی شبنمی نگاہ کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور جس نے ان کے کلام کے ایک معتدبہ حصہ کو نقش فریادی بنا دیا ہے ۔ ان کے دیوان کا پہلا شعر خود اس کا ثبوت ہے ۔ انہوں نے نقش حیات اور نظارۂ کائنات کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا ۔

ع
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مرزا غالب کی ظرافت بڑی پہلودار ہے جہاں ان کے ہاتھ میں کھلا نشتر نظر آئے وہیں آستین میں دشنہ پنہاں ہوتا ہے ۔ ان کے یہاں ہلکے پھلکے مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں ۔ لیکن جہاں اس میں معمولی سا خم آیا اس کی تیزی اور تیکھا پن بڑی گہرائی تک وار کرتا ہے ۔ ان کی ظرافت میں جو چیز محض شوخی معلوم ہوتی ہے وہی طنز کی صورت میں نشتر بن کر دل میں اتر جاتی ہے ۔

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ایسے نہ جانے کتنے مصرعے ان کے دیوان میں ہیں جو نشتر ہوتے ہوئے بھی رگ و جان بن جاتے ہیں ۔

انہوں نے عشق و محبت کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا ۔ محترمی سرور صاحب لکھتے ہیں "انہوں نے صبح و شام ، دن و رات ، جاڑا گرمی ، بندر یچھ ، ہولی دیوالی کی کیفیات نظم نہیں کی بلکہ عشق کے دل کی حالت اور معشوق کی اندرونی

ان سب میں انکی شوخی ہے۔ نقش آفرینیاں کرتی ہیں اور اہل بصیرت کو متعجب و متحیر بناتی ہے۔ اس شعر میں دیکھئے غصہ کے جذبے کو کس شوخی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

غالب کے یہاں رنج و غم سے بہلاوا بہت اچھی طرح ملتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

مرزا کے کلام کی خوبیاں تو نہ معلوم کیا کیا ہیں اور کتنی ہیں مگر سب سے بڑی خوبی میری نگاہ میں یہی ہے کہ ہندوستان کا کوئی شاعر ان کے مقابلے پر نہیں ٹھہرتا۔ گویا ان کا کلام ایک تیز شراب ہے جس کے بعد کوئی نشہ نہیں چڑھ سکتا۔ ان کا رنگ جمنے کے بعد کوئی رنگ نہیں جم سکتا۔

حالانکہ مومن بھی ایک بہت بڑے شاعر تھے مگر ان کے یہاں پیچیدگی اور تعقب ہے۔ مگر غالب کا کلام تعقب سے کوسوں دور ہے اور خود کہتے ہیں کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کسی ایک فرقے یا قوم کا شاعر نہیں اس کی حیثیت اور شخصیت ہمہ گیر ہے۔ غالب سے پہلے اور غالب کے بعد کوئی غالب نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ بقولِ اقبال

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس قدر شعروں کو اور ان کے کلام کو انکی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کو دیکھ کر کوئی بھی عقل سلیم فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ دیوانِ غالب میں بے ساختہ شعروں کی کمی نہیں۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے بلکہ ایک اور احسان بھی ہے جس سے اردو کی شاعری اپنے قیام و بقا تک کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کیفیت نظم کی ہے۔ انہوں نے عاشق کے دل میں گھس کر اس کے جذبات (عاشقانہ) کی گہرائیوں کو ٹٹولا اور ان (جذبات) کی شاعرانہ انداز میں عکاسی کی یعنی وہ داخلی کیفیت کے مصور رہیں۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

فرض غالب کے تغزل میں شوخی کا پہلو مختلف زاویوں سے رونما ہوتا ہے۔ انکی غزلیں شوخی سے بھری پڑی ہیں اور سب کچھ انکی رنگین پرکار اور پہلو دار شخصیت ہی کا نتیجہ ہے۔ غالب زندگی کے شیدائی تھے۔ لیکن انہیں زندگی کا غم کبھی نہ تھا۔ زندگی کی شگفتگی نے ان کے یہاں مسرتوں کے احساس کو بیدار کیا اور ان مسرتوں کے احساس نے شاعری کے بڑے حصے کو دامان باغبان اور کف گل فروش بنا دیا۔

بندگی میں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار میرے بالیں پہ لائے ایسے پر کس وقت

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں

آتا ہے یاد حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ان کے یہاں خودداری بھی بہت ہے۔ ایک جگہ بہشت کی حالت کا اظہار کیا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک جگہ بہشت کہتے ہیں اور معشوق کی گلی سے مشابہ کرتے ہیں۔

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہی مگر اس قدر آباد نہیں

ایسے ہی اور شعر بھی ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ شوخی مزاج نے ایک جگہ جنت کو ایک گلدستہ بنا دیا ہے جو ایک طاق پر رکھا ہوا ہے اور رکھ کر بھول گئے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ طاق ہی پھول کا بنایا ہے۔ دوسری جگہ جنت کی موجودگی کے مٹنے یہ کہا کہ جی ہاں جی ہاں معلوم ہے جنت کی حقیقت معلوم ہے بس یاد کئے جاؤ اور خوش ہو جاؤ۔

ان کے انداز ظرافت ہی سے ظرافت نمایاں ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ انسانی جذبات میں جتنے جذبے ہو سکتے ہیں

شرف عنبریں
ایم اے (سال دوم)
میسور یونیورسٹی

غالب کی فن کاری

شاعری ایک فن ہے۔ ایک صناعت یعنی آرٹ ہے۔ فنون لطیفہ کے لئے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہوتے ہیں۔ چونکہ شاعری بھی فنون لطیفہ میں سے ایک فنِ لطیفہ ہے لہٰذا اس کے لئے بھی کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں۔ فنون لطیفہ کے اصول اور ضابطے صرف خارجی باتوں پر مشتمل نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق داخلی امور سے گہرے طور پر ہوتا ہے۔ شاعری کی روح ہوتی ہے اور جسم ہوتا ہے۔ شاعری فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ مرکب اور ترقی یافتہ فن لطیف ہے اس میں رقص و وجد بھی ہے، صنم سازی و تعمیر کا حسن بھی، مصوری اور موسیقی کے جلوے بھی۔

آئیے اب غالب کی فن کاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی فن شاعری کی خصوصیات پر نظر ڈالیں۔

فن شاعری کی جانچ صرف علم عروض کے اوزان پر نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ دیکھنا اور پرکھنا ہوگا کہ غالب نے اپنے میڈیم کا استعمال کس انداز اور کس ڈھنگ سے کیا ہے۔ انہیں کن تجربات، کن جذبات اور کن احساسات نے اظہار و بیان پیدا کیا اور تفسیر و تعبیر تجربہ کے کیا اسلوب ہیں۔ حالی کے نزدیک "جدت مضامین" طرفگی خیالات، نئی اور موزوں تشبیہوں کا استعمال، استعارہ و کنایہ کا برمحل برتاؤ اور شوخی و ظرافت کلام غالب کے عناصر ترکیبی ہیں۔ تخیل کی بے باکی جو غالب میں بدرجۂ اتم موجود تھی تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوتی رہی۔ تخیل کو غالب کی شاعری کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے یہی ایک بڑی چیز ہے جو شرق کے اس عظیم شاعر کے کلام کو تمام دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ تخیل شعر کا اصلی اور حقیقی جوہر ہے، اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اقبال نے اسی بنا پر غالب کی شان میں کہا ہے۔

فکر انساں پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

تخیل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے "وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کردے"

یہ قول اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اسے جامع اور مانع تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ تخیل حقیقت میں قوتِ اختراع کا نام ہے۔ شاعر ایک ہی چیز کو دیکھتا ہے۔ لیکن مختلف اوقات اور مختلف حالتوں میں اپنے جذبات اور طبعی رجحانات کے مطابق ہر دفعہ نئے نئے لطائف و ظرائف استخراج کرتا ہے۔ گویا کائنات کی ہر چیز اس کے لئے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی مثل ہے جو ہر پہلو سے ایک نیا رنگ اور نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور ہر دفعہ جو نتائج یا جو مضامین بھی اس کے ذہن میں آتے ہیں وہ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہاں پر چند مثالیں دی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ شاعر کا تخیل ایک ہی چیز میں کیا کیا معجزات پیدا کر سکتا ہے اور ہر بار تصور و تجربہ کی تازہ کاری اور اصلیت کی مدد سے کس طرح اس میں رنگ، دردمندی، تازگی اور معنویت پیدا کرتا ہے۔

پھول ایک ہی چیز ہے۔ لیکن دیکھئے کہ اس سے زندگی کی بے ثباتی پر کس کس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یہاں جب شاعر نے لالہ و گل کو دیکھا تو اسے خیال ہوا کہ زمین جس میں لاتعداد حسین خاک سے مل کر خاک ہو چکے ہیں شاید انہیں کو دوبارہ ان خوش نما اور شوخ و رنگین پھولوں کے لباس میں ہمارے سامنے لا رہی ہے یہ حسنِ تخیل کی بہترین مثال تھی۔ اسی طرح غالب جب بہت سے پھول اور غنچوں کو باغ میں دیکھتے ہیں تو ان کا تخیل فوراً ایک نئی صورت پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

یعنی غنچہ اگرچہ عدم سے عالم ہست و بود میں ابھی نہیں آیا ہے، لیکن اس کی شکل و ہیئت بتلاتی ہے کہ وہ پھول کی پژمردگی اور ناپائیداری پر ایک عالم حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جہاں کی زندگی ایسی ہی بے مقدار ہو وہاں میں جا کر کیا کروں گا۔ ایک اور شعر ہے۔

گلشن کو تیری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

یہاں غنچہ نہیں کھلا گویا محبوب کے شوق میں اس نے اپنے بازو بے اختیار پھیلا دئے ہیں۔ اسی طرح یہ دو اور شعر ہیں ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
گم کیا ہوا دیکھا کھو کیا ہوا پایا

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک ؎ بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

(۱) اشعار سے غالب کے تخیل کی وسعت کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وہ زندگی کے روزمرہ اثرات میں ایک ہی چیز سے کئی کئی نتائج پیدا کرتے ہیں اور ہر ایک بیان تراش خراش کی ندرت، نفاست و لطافت، جذبۂ تخیل کی گھلاوٹ سے ایک مقناطیسی کشش بھر دیتے ہیں۔

معنی آفرینی غالب کے کلام کی خاص خصوصیت ہے۔ جب ہم ان اشعار پر غور کرتے ہیں ہر دفعہ معانی کا ایک نیا جہان سامنے آتا ہے۔ ہر بات سے ایک نہ ایک لطیف نکتہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ یہ معنی گویا ایک معدن ہے کہ جس قدر کھودتے جاؤ جواہرات بھی نیچے سے برآمد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس شعر سے جہاں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ محبوب جب بھی چاہے بڑی خوشی سے ہمیں بلا سکتا ہے تو ہم تعمیلِ ارشاد میں فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ وہاں ایک اور معنی بھی پیدا ہوتے ہیں جنھیں اصل میں ایک اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تعلیم سمجھنا چاہیے۔ گیا ہوا وقت دوبارہ ہاتھ نہیں آیا کرتا۔ لہٰذا اسے بیہودہ باتوں میں ضائع نہیں کر دینا چاہیے۔ ایک خود مرزا کا آنا ہے دوسرے وقت کا لوٹ آنا۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

شاعر بسترِ علالت پر ہے۔ ضعف سے حرکت کرنے کی بھی تاب نہیں اور اغیار ہیں کہ وہ بجائے عیادت کے الٹا زخم پر نیش زنی کرتے ہیں اور کہتے ہیں گویا کہ ایک تو بے نصیب ہجر کا مارا یہاں تڑپ رہا ہے اور ایک ہم ہیں کہ دوست کے ساتھ مزے سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں تک تو بات ہوئی۔ لیکن دوسری حیثیت سے شاعر کو اپنے ضعف اور کمزوری کی شدت کا اظہار منظور ہے اور کہنا ہے کہ میں ان باتوں کو بڑی خوشی سے برداشت کروں گا اور کیسے نہ کروں جب کہ میں ضعف کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تکیے سے اپنا سر ہی اٹھا سکوں۔ یہاں بھی ایک سر کا اٹھانا ہے اور ایک بات کا اٹھانا یعنی اسے برداشت کرنا۔

غالب اپنے تجربوں کے اعتبار سے اہمیت رکھنے والے شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے افق کو وسیع کیا اور اپنے نادر تجربوں کو جذباتی تخیلی اور جمالی حیثیت دے کر انہیں شاعرانہ بنا دیا۔ ملاحظہ ہو

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا ۔ افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد ۔ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
[illegible] مہرِ درخشاں پر ۔ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

مندرجہ بالا اشعار کے فنی تجزیہ سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں مشاہدہ، تصور، زبان، احساسات، جذبات، تخیلات، و واردات [illegible] سے گزر کر شاعرانہ تجربے کی نئی زندگی داخل کر لیا ہے۔ ان اشعار میں حسن تجربہ، حسن اثر کے ساتھ [illegible]

غالب فن کار کی حیثیت سے اپنے واسطۂ اظہار (MEDIUM) کو کامیابی سے استعمال کرتے ہیں۔ غالب کی فن کاری میں ہمیں تخیل کی پرواز، ادراک کی قوت، وجدان کا حس، درد و گداز، مزاح و طنز، جدت، تازہ خیالی اور نازک خیالی کے جلوے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں واقعیت کا حسن بھی ہے اور مثالیت کا جمال بھی وہ ایک طرف مصوری اور ٹھوس بت گری کرتے ہیں تو دوسری جانب اشارت اور ایمائیت سے بھی کام لیتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں لطافت گہرائی، بلندی اور وسعت پائی جاتی ہے۔ ان سب خصوصیات کی ترکیب سے غالب کے فن کی تشکیل ہوتی ہے، تخیل کی بلند پروازی کی مثالیں تو دی جا چکی ہیں اب روح بغاوت، ازلی تشنگی اور خودی کے جلوؤں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہیں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں ۔ مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔ الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا!

ان کے اشعار میں متحرک بت گری دیکھئے۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے ۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

شوخی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۔ قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن ۔ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۔ اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

سوز و گداز کی مثالیں بھی غالب کی شاعری میں بہت ہیں

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ۔ حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں ۔ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۔ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اب غالب کے فن کی پیش کش کا جائزہ لینا ہے۔ ان کی شاعری کے اسلوب و طرز کا اور ترکیب [illegible]۔ غالب کی پیش کش میں ہنرمندی، شائستگی، [illegible] قلم کاری، اشاداں اور مجموعی دل کشی پائی جاتی ہے ـــ انتخاب الفاظ، ترتیب بھی غالب نفیس اور رفیع ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ [illegible] کی مرضی کے تحت اکرام نے لکھا ہے کہ [illegible] نظر غالب کو طرز بیان کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے اعلیٰ ہیں، [illegible] زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے جو یک جگہ مقبول ہیں۔ دوسری جگہ ناپسند، [illegible] تو یہ خیال بے شک صحیح ہے لیکن اگر ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب [illegible] تنگی [illegible] ۔

اردو شعرا سے بلند ہے وہ صرف معنی پرست نہ تھے بلکہ حسن ظاہری کی قدر و قیمت بھی پہچانتے تھے۔ ان کے اشعار میں الفاظ نقط اظہار مطلب ہی کا وسیلہ نہیں بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ ان کا استعمال اور ترتیب ایسی ہے کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر ان کا ترنم اور ہم آہنگی بھی بہت پر لطف ہے" لیکن پیش کش کے اس میدان میں غالب کی ناکامیاں بھی بڑی تلخ ہیں وہ کبھی اسیت برت کر بڑی مصنوعی چیز پیدا کرتے ہیں۔ جب تجربہ کی جگہ محض قوافی یا سخت زمین اس کی رہبر ہوتی ہے تو صناعت کی روح آسمان کی طرف پرواز کر جاتی ہے اس کا جسد بے جان بھدا اور بدصورت ہو کر بے توقیر اور بے اثر ہو جاتا ہے مثلاً ؎

کافی ہے نشانی تیرا چھلے کا نہ دینا - خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں - دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

غالب کے اشعار میں حسنِ صناعت ملاحظہ ہو۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی - جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے - جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے۔
نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں - ہے تقاضائے جفا شکوہ بے داد نہیں

غالب کے وہ مشہور قطعات جو ان کی قوتِ تعمیر کی دلیل ہیں خصوصاً یہ قطعہ "پھر اس انداز سے بہار آئی" اور "لے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل" فن کاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان میں غالب کی حسرت تعمیر ایک حد تک نکل گئی ہے۔ ان میں حسن تجربہ کے ساتھ حسن پیش کش بھی ہے۔ ان میں ارتقائے خیال کے ساتھ بڑی شاعرانہ صناعی بھی ہے۔ ان میں استعاروں کی مدد سے بڑی معنی آفرینی بھی کی گئی ہے۔ معنی آفرینی، صناعت یعنی آرٹ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس اعتبار سے غالب ایک بڑے صناع۔ ایک ذہین فن کار اور ایک حسن آفریں شاعر ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۷۹ پر)

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس کو انگشتِ حنائی کا خیال بھی انہیں ستاتا ہے

دل سے مٹنا تیری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا

اس کی زلفیں باعثِ سکون و مسرت ہو سکتی ہیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں - تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

شمیم خانم بی۔ ایس۔ سی (سالِ سوم)
نائب صدر بزم اردو

غالبؔ کی شاعری

اردو ادب کا لہلہاتا ہوا چمن تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اس کی آبپاشی مختلف فرقہ و قوم کے لوگوں نے کی ہے۔ ان میں سے ایک غالبؔ بھی ہیں۔ غالب اردو نثر و نظم کے استاد تھے۔ اردو شاعری میں جو شہرت آپ کو حاصل ہوئی وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوگی۔ مرزا نے شاعری بچپن ہی سے شروع کی اس فن میں انہوں نے کسی کو اپنا استاد خیال نہیں دیا اور نہ کچھ پتہ چلتا ہے کہ کوئی شاعری میں ان کا استاد تھا وہ محض اپنی فطری و معنی یاب طبیعت اور شاعری کے فطری مذاق کے سبب سے شاعر بنے۔ غالب کی ابتدائی شاعری میں فارسی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ غالب بیدل کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ اس لئے انکی شاعری بھی بیدل وغیرہ کے رنگ میں تھی۔ مگر وہ طرز مشکل اور عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس وجہ سے ان کے احباب نے ان کو مجبور کیا اور آخر ان کو اپنا رنگ تبدیل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس رنگ کے چھوڑ دینے پر بھی ان کی شاعری بلیغ رہی مگر پھر بھی پہلے سے بہت آسان ہوگئی۔ اگرچہ پہلے ان کے کلام کی قدر نہیں ہوئی مگر جیسے ہی انہوں نے نئی روش اختیار کی زمانے میں دھوم مچ گئی۔ دراصل مرزا فارسی کے شاعر تھے اور فارسی کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے اور انہیں اپنے فارسی کلام پر بہت ناز تھا۔ اس کے مقابلے میں اردو کے مجموعے کو حقیر سمجھتے تھے۔ مگر زمانے نے انکی اردو کو فارسی سے ہزار درجہ قدر زیادہ کی۔ اس کے چند وجوہات ہیں جس میں سب سے بڑی وجہ یہ کہ مرزا کے زمانے تک شاعری جس شاہراہ پر تھی۔ مرزا نے اس سے انحراف کر کے ایک نیا راستہ اختیار کیا جس کے وہ موجد مانے گئے۔

بقول غالب ؎ ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے

کیطرح غالب کو کیا خبر تھی کہ مرنے کے بعد اسی اردو کلام اور خطوط کے ذریعہ حیاتِ دوام ملے گی جو ان کے قلم نے اردو زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔

غالب میں شاعری محسوسات انسانی کا وہ پر کیف اور رنگین طرز ہے جس میں موزونیت کی قید کا پابند نہیں شاعری دراصل کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ اس کی حقیقی کیفیات سے صحیح معنوں میں وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جن کا قدرتاً اس کی طرف رجحان ہو۔ صرف وہی شخص شاعر بن سکتا ہے جس میں شاعری کا مادہ ہو ورنہ عام شاعری

سوائے سوسائٹی زبان اور رسم و رواج کو برباد کرنے کے اور کچھ نہیں۔ چند نام نہاد شاعروں کی وجہ سے زبان میں فحش الفاظ داخل ہو جاتے ہیں۔ اور زبان متانت و سنجیدگی سے خالی ہوتی ہے۔ دوسری طرف حقیقی شعراء لگ ہیں جن کے ذریعے دنیا کے بہت سے کام نکلتے ہیں اور ان کے طرز انداز اور جادو بیانی سے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوتے ہیں۔

اپنی عزیز زبان اردو کے بلند پایہ اور عدیم المثال شاعر غالب کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ خداداد قابلیت کا نتیجہ تھی۔ مرزا کا پایہ شاعری میں بلند ہے اور اس کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ وہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات شاعر تھے وہ ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی قابلیت کا اندازہ انکے فارسی کلام سے ہو انہیں اس بات پر بڑا افسوس تھا کہ لوگ فارسی سے بیگانہ تھے اور ان کے کلام کا کوئی قدرداں نہیں۔ انکی شہرت فارسی کے کلام سے نہیں اردو کے کلام سے ہے جس کی وہ قدر نہ کرتے تھے۔ پھر بھی انکی ذہانت طبعی اور فطری شاعری کا پورا اثر ان کے کلام سے ظاہر ہے جس میں جدت خیال، جدت زبان اور تشبیہات و استعارات، جدت الفاظ غرض ہر طرح کے جدید مضامین مرزا کی خاص جدت طرازی سے بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ معمولی سے معمولی خیالات کو اپنے اسلوب سے اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ اس میں خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک دوسری خاص بات مرزا کے کلام میں یہ ہے کہ ان کے الفاظ وسیع ہوتے ہیں اس وجہ سے مرزا کے کلام میں قافیہ پیمائی نہیں تیسری چیز نظر فریب تحریر ہے۔ مرزا اپنے اشعار میں کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والوں کا خیال خود بخود اس کے لوازم جمع کر لیتا ہے۔

مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز جادۂ عوام سے علیٰحدہ ہے جس کا شوق انکے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔ انکی مشکل پسندی کی وجہ سے عام دماغ آپ کے کلام کا لطف نہیں اٹھا سکتے تھے اور چونکہ خصوصیت جذبات کا ادا کرنا ہے۔ انکے اشعار ان کے خیالات کا عکس ہیں وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ غم والم کے نالے نہیں بلکہ ان کی بلند عظمت کا مرقع ہے کہیں اپنی ہجوم ناامیدی کہیں حرماں نصیبی کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری غرضیکہ ہر بیان صحیح معنوں میں عکس ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

مرزا کی شاعری جذبات سے بھرپور ہے۔ مناسب و بکالیف زندگی نہایت موثر الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور کئی جگہ مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد پائی جاتی ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

مرزا نے بہت سے ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جو بالکل سہل اور آسان ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں باریکیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو دوسرے شعرا کے کلام میں نہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور غالب کو پینے پلانے کا ہمیشہ شوق رہا عرض مدعا کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے تھے اور کسی مسئلہ پر صاف صاف گفتگو کرنے سے کبھی نہیں شرماتے تھے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

غالب کی شاعری کے چند خصوصیات

۱) اندازِ بیان عمدہ ہونے کی وجہ شعر چمک اٹھتا ہے
۲) چونکہ آپکی عمر ہمیشہ مصیبت اور تکلیف میں کٹی اسلئے آپ کا کلام درد، سوز و گداز سے بھرا ہوا ہے۔
۳) زبان میں فصاحت سادگی اور مضامین کی جدت غالب کی سی بہت کم شعرا میں پائی جاتی ہے۔
۴) الفاظ کا صحیح اور باموقع استعمال اور انکی ترتیب و ترکیب شعر کے اندر جان پیدا کر دیتی ہے اور موسیقی کا مزہ آتا ہے
۵) گو ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں اخلاقی اور حکیمانہ مضامین اس سادگی صفائی اور خوبی سے نبھاتے ہیں جن پر سینکڑوں بلند پروازیاں قربان ہیں۔
۶) کلام میں فصاحت و روانی بے انتہا ہے اور باوجود سو برس پرانی ہونے کے آج بھی ویسا ہی تازہ ہے۔

ان تمام خصوصیات کے باوجود انکے کلام میں اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔ غالب نے اپنی خصوصیت کا ذکر خود ہی کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

اس کے علاوہ ان کے کلام میں انفرادیت ہے کیونکہ وہ ایک زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے یہاں

وہ بہر دلچسپ پایا جاتا ہے، جسکی وجہ سے ایک غزل گو کا کلام دوسرے غزل گو کے کلام سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں بے حد اپچ تھی۔ وہ کسی کی تقلید کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تقلید کرتے بھی تھے تو اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ فطرت انسانی کے بہترین رمز شناس تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں جو انسان کی زندگی سے مطابقت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی میں اکثر ایسے مواقع آئے ہیں کہ ہم کسی اور شاعر کی بہ نسبت غالب کے اشعار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں فلسفہ اور تصوف کی آمیزش ہے۔ انکا تخیل عام طور پہ بہت بلند ہے۔ تخیل کی بلندی کی تعریف علامہ اقبال نے بھی کی ہے۔ کہتے ہیں

ہے فکر انساں پر تری ہستی سے یوں روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

لیکن غالب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی ہمہ گیر شخصیت ہے۔ غالب کو ایک ترشے ہوئے ہیرے سے نسبت دے سکتے ہیں۔ عبدالرحمن بجنوری نے تو غالب کے کلام کو الہامی تک کہنے کیلئے تیار ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف دو الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب

(بقیہ صفحہ ۹۲)

غرض یہ کہ اس طرح معشوق کے حسن کا بیان انہوں نے کیا ہے اور ان کی شاعری اس قسم کے بیانات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اس طرح کے اشعار کو دیکھنے سے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ حسن سے زیادہ اس کی اداؤں، اس کی شوخیوں۔ اس کی سج دھج اور طور طریقوں سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کا لطیف احساس معاملہ بندی شاعروں کی طرح صرف حسن سے براہ راست اور فوراً مطلب براری نہیں چاہتے۔ بلکہ اس سے صحیح معنوں میں پہلے اکتساب لذت کرتا ہے۔ وہ پہلے معشوق کے سرو لیے قد۔ اس کی زلفوں اور ابروؤں سے کھیلتے ہیں۔ اس کی تقریر، اس کے خرام ناز اور اداؤں سے متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ غالب نے اس حسن کو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بیان کیا بلکہ اپنی ذات۔ اپنی شخصیت۔ اپنی افتادِ طبع۔ اپنے کردار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو سامنے لاتے ہیں بات دراصل یہ ہے کہ غالب صرف خارجی حسن کو پیش کرنے کے قابل نہیں تھے۔ خارجی حسن بذاتِ خود ان کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ انہوں نے اس کے ذہن اور جذباتی رد عمل کو پیش کیا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے ان کے بیان سے صرف معشوق کا حسن بے نقاب نہیں ہوتا۔ اس کی اداؤں اور اشاروں ہی کی تصویر سامنے نہیں آتی بلکہ غالب کا تاثر بھی سامنے آتا ہے۔ حسن سے خود ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ساتھ ہی معشوق کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔ خود غالب کی ذات، اور شخصیت معشوق کے حسن کے بیان میں بھی غالب نظر آتی ہے۔

نیلوفر ثمینہ
ایم نشنے (سال دوم)
میسور یونیورسٹی

غالب کی راست گوئی

غالب کی راست گوئی کے دوست و دشمن سب معترف ہیں۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ خود اعتمادی سے ہر چیز کا کھوٹا کھرا الگ کر دکھاتے تھے نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے تھے نہ کسی کی خاطر جھوٹ بولتے تھے۔ مرزا کی آزاد قوت فیصلہ کا اندازہ ان کا طور یہاں ایک سرسری مطالعہ سے بھی ہو جاتا ہے وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو نظر تنقید دیکھتے تھے بلکہ اگلوں کے فیصلے کے سامنے بھی بزرگانہ سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ سب حق ہے کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے۔

اسی طرح وہ بظاہر محب وطن بن کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینا نہ چاہتے تھے انہوں نے براہ راست انگریزوں سے مخلصانہ تعلقات قائم کئے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کا نظام حکومت ہر طرح سے مغلیہ نظام سے بہتر ہے۔ انہوں نے خود غرضی سے انگریزوں سے دوستی و محبت قائم نہ کی تھی اس کا ثبوت اُن کا وہ پر درد مرثیہ بھی ہو سکتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست اسٹرلنگ کی وفات پر لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے لئے غدر کا سانحہ ایک الم ناک واقعہ ہے۔ کیونکہ اس میں شریف ذلیل ہو گئے تھے۔ اور زندگی کی قدریں بدل گئی تھیں۔ دہلی کے شرفا کی بدحالی سے وہ ضرور متاثر ہوئے ہیں یہ سب حادثات ان کے دل میں سب انگریزوں کے لئے نفرت نہ پیدا کر سکے۔ ان کی یہ وسیع النظری ان کی انسان دوستی کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ غداری اور بے وفائی کو۔

ان کی صاف گوئی کی ایک مثال سر سید احمد خاں کی آئین اکبری کا مقدمہ لکھنے کے سلسلے میں بھی ملتی ہے جب غالب کو سر سید نے اپنی کتاب کا مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تھی تو غالب نے اس کا مقدمہ تو نہ لکھا لیکن بڑی صفائی سے اپنے خیالات کا (صحیح ہو یا غلط) ایک مثنوی میں صاف صاف اظہار کر دیا اور سر سید احمد کی خاطر ہی سہی جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ان کی کتاب پہ داد نہ دے سکے۔

حالی کا کہنا ہے کہ غالب وعدہ و اقرار اور بات چیت میں بھی نہایت راست گفتار تھے ... بگار عالی ہیں یا

حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا ہر گز اس کی تعریف نہ کرتے تھے اور جب انہیں کوئی شعر پسند آجاتا تو جھوم جھوم کر اس کی تعریف کرتے وہ ان کے دشمن کا ہی شعر کیوں نہ ہو۔

مثلاً ایک بار ذوق کے اس شعر کو حالی سے بار بار پڑھواتے رہے اور سر دھنتے رہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسی طرح مومن کے ایک شعر کے متعلق انھوں نے کہا تھا کہ "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔ وہ شعر ہے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

داغ کے اس شعر کو بھی انھوں نے بہت سراہا تھا

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

غالب کے خطوں سے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے دوستوں کے سامنے اپنے خانگی حالات اور ذاتی مشکلات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ آج گھر میں چولھا نہ جلا وغیرہ۔ اسی طرح وہ اپنی بادہ خواہی کو چھپانا بھی ضروری نہ سمجھتے تھے۔ غالب کے خطوط عام طور پر بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اُن کے خطوط میں اُن کی راست گفتاری سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کی شاعری بھی ان کے اچھے بُرے خیالات کی حقیقی ترجمان ہے جو بھی جذبات و احساسات ان پر طاری ہوتے وہ بلا تامل شعر میں باندھ دیتے تھے۔ شاعری میں کسی کی تقلید کرنا یا اکتسابی شاعری کرنا انہیں ذرا بھی پسند نہ تھا بقول سید احتشام حسین، وہ خوب جانتے تھے کہ ذہنی غلامی مادی اور جسمانی غلامی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ موقع یا وقت کا لحاظ بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کے تلخ و شیریں، اچھے اور بُرے تجربات کی جھلک ان کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ حالات نے ان کو کبھی احساس برتری، فخر اور خود اعتمادی میں مبتلا کیا تو کبھی انہیں مجبور بے کس اور شرمندہ کر دیا۔ ان کی شاعری میں یہ متضاد پہلو صاف نمایاں ہیں۔ کبھی وہ ولی نظر آتے ہیں کبھی بادہ خوار کبھی صوفی نظر آتے ہیں۔ کبھی قلندر کبھی قنوطی نظر آتے ہیں تو کبھی رجائی کبھی خدا پرست تو کبھی منکر۔ الغرض ان کے کلام میں بھی ظاہر ہے۔ ان کی شاعری میں جو سچائی نظر آتی ہے۔ اس کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری مغلیہ دور کی ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے۔

"صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"

مذکورۂ بالا باتوں کے باوجود بھی غالب کی راست گوئی کے بارے میں بلاجھجک نہیں کہا جاسکتا کہ غالب ہمیشہ راست گو رہے ہیں دو ایک واقعے ایسے بھی ہیں جہاں غالب جیسا عظیم، سخت اور توانا شخص بھی حکمرانوں کے سامنے اپنی ساری خودداری اور راست گوئی کو برطرف رکھ کر اُن کی خوشامد کے لئے اپنی ضمیر سے ناانصافی کر دیتا ہے۔ جیسے کہ اپنی کتاب دستنبو میں انہوں نے جو غدر کے زمانے کے واقعات جمع کئے ہیں وہ سب صاف اور آزادی سے نہیں لکھے ہیں۔ اگر غالب انگریزوں کا خیال و لحاظ کرکے یہ کتاب نہ لکھتے تو ان کی کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہو جاتی۔ کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو شروع غدر سے آخر تک دہلی میں موجود تھا۔

اسی ضمن میں ایک اور رباعی کا ذکر بھی ضروری ہے جو یادگار غالب میں درج ہے اور جس کو بقول حالی غالب نے ظفر کے دربار میں بادشاہ کو خوش کرنے اور مزاج پیدا کرنے کے لئے سنائی تھی۔ وہ رباعی یہ ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے ہی سہی۔ غالب کو اپنے مذہبی عقائد غلط بتا کر مزاج پیدا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے تھی۔ اس سے ان کی خودداری پر ضرب لگتی ہے

لیکن غالب کو ان پہلوؤں سے دیکھ کر ہماری نظروں میں ان کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی بلکہ ہمیں ان پر رحم آتا ہے کہ بیچارے غالب جو ایک شاہانہ شخصیت کے مالک تھے۔ کسی طرح اپنی مفلسی سے مجبور ہو کر ان حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھار اپنی آنا کو بھی جو اُن کو اس قدر عزیز تھی بھول جاتے ہیں۔

آخر میں اتنا تو بطورِ مجموعی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب ایک راست گو۔ حق پسند انسان تھے اور وہ عام طور سے سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے تھے۔

میں تو رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غالبؔ

منورہ بانو
پی یو سی

غالبؔ کی عظمت

غالب ہندوستان ہی کا شاعر نہیں بلکہ کائنات کا شاعر ہے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ کو ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید اردو نثر نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اور قدیم شاعری بھی اسی گھوارے میں کھیل کود کر جوان ہوئی۔ لیکن غالب کے احسانات فقط اردو نظم و نثر پر نہیں۔ فارسی بھی ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ غالبؔ کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن انکی اہمیت فقط شخصی اور انفرادی نہیں۔ ان کا مطالعہ فقط اس لئے دلچسپ نہیں کہ انہوں نے شگفتہ دلفریب نثر اور دلگداز آبدار شعر لکھے۔ بلکہ وہ ہمارے ادب میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرزا غالب نئی نسل کے محبوب ہیں اور قدیم روایات کے بہترین ترجمان۔

مرزا کے عنفوانِ شباب کا بیشتر حصہ کھیل کود اور لہو لعب میں صرف ہوا۔ لیکن انکی تعلیم سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ مرزا کے والدہ خود لکھنا جانتی تھیں۔ انہوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا۔ معاصرانہ تذکروں سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے اور مرزا کے اساتذہ میں آگرہ کے دو مشہور مدرسین نظیر اکبرآبادی اور مولوی محمد معظم کے نام لئے جاتے ہیں۔ مرزا کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی۔ منطق، فلسفہ، اور علم ہیئت کی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ بقولِ حالی۔ جن مشکل ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں ان میں شعر گوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم سے بھی بڑھ کر جو چیز مرزا کے علم و فضل کا طرۂ امتیاز ہے وہ ان کی فارسی زبان اور ادب سے واقفیت ہے۔ انہوں نے گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر اور آٹھ نو سال کی عمر میں اردو شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔

غالبؔ نے قیامِ آگرہ کے دوران جو اشعار لکھے وہ نسخۂ بھوپال میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ اس نسخے کے کونسے اشعار آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے آسان نہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً

جگر سے ٹوٹے ہوئے منہ کی ہے سناں پیدا ؛ دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

ایک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہوں وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ آپ حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا۔ اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے۔ مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔

غالب کی شخصیت زندگی سے اس قدر بھرپور ہے کہ اس کا تجزیہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اقبال کی شخصیت کا تجزیہ آسان ہے۔ اس لئے کہ ان کی شخصیت ایک نظامِ فکر میں سمٹ کر محدود ہو گئی ہے۔ اقبال کا فلسفہ اقبال کا شاہکار ہے اور غالب کی شخصیت فطرت کا شاہکار۔ زندگی سے بھرپور شخصیت سے مراد یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں زندگی کے تمام متضاد اور متناقص پہلو اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان کے احساسات جتنے قوی تھے اتنی ہی ان کی فکر بلند تھی۔ عقل و جذبہ کی آویزش جیسی غالب کے یہاں ہے اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں ہے۔ پھر ان کے جذبات میں بھی تصادم ہے ان کے یاس امید سے، رجائیت قنوطیت سے، سکون اضطراب سے اور بت پرستی دہر پرستی سے برسرِ پیکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ایسی ڈرامائیت ہے جس کی مثال داخل شاعری میں آسانی سے نہیں مل سکتی وہ عشق کرتے تھے اور اس میں گم ہو جاتے تھے سے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مگر وہ اس میں ایسے گم نہیں ہوتے کہ پھر ہوش ہی نہ آئیں۔ دم ہوش میں آجاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ عشق بیخودی

کا ذریعہ تو ہے لیکن صرف عشق ہی نہیں ان کی زندگی بھی بیخودی کا ذریعہ بن سکتی ہے

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

اس طرح عشق ان کی شخصیت کے ایک گوشے میں سما جاتا ہے اور ان کی شخصیت عشق پر محیط ہو جاتی ہے۔
کہیں کہیں غالب کے عشق میں بھی میر کی آشفتہ سری اور خود فراموشی بھی نظر آجاتی ہے۔

مر گیا چھوڑ کے غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تیری دیوار کے پاس

لیکن میر کے برعکس غالب کی شخصیت عشق میں مدغم نہیں ہونے پاتی اور ان کے یہاں ہم ایک ایسی کیفیت بھی پاتے ہیں جب وہ یادِ یار سے محروم ہو کر بھی اپنی شخصیت کو برقرار رکھتے ہیں۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب کی شخصیت کا تجزیہ کرنا دشوار ہے اس لئے کہ خرد اور جنوں، دیوانگی و ہشیاری، اور عقل و عشق کا ان کے یہاں ٹکراؤ اور ایسا امتزاج ہے کہ انہیں عاشق کہا جا سکتا ہے نہ فلسفی اور یہی ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

[illegible] لیکن زندگی ایک ہنگامہ ہے جس میں ان کی ہستی اور ان کا رونا الم ہو جاتا ہے کہ [illegible] دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ خود کا محاکمہ کر سکیں

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

غالب کی عظمت کا راز یہ نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں متضاد عناصر موجود ہیں۔ ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ ان کے یہاں کثرت [illegible] وحدت میں بدل گئی ہے۔ اگر غالب کی جگہ معمولی شخصیت کا انسان ہوتا تو اس کی شخصیت ان متضاد عناصر کے تصادم کی تاب نہ لا کر [illegible] منتشر ہو جاتی اور [illegible] کی منزل آ جاتی۔ لیکن غالب کی عظیم شخصیت نے ان متصادم عناصر میں ہم آہنگی اور ان مختلف اجزا میں توازن پیدا کر کے انہیں ایک وحدت میں تبدیل کر دیا۔

زبیدہ بیگم
بی۔ اے (سال اول)

غالب کا لال قلعے سے تعلق

مرزا اسد اللہ خاں غالب اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ تھا جب وہ کسی جنگ میں مارے گئے تو ان کی کفالت مرزا نصر اللہ بیگ جو ان کے چچا تھے کرتے رہے مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کے چچا بھی انتقال کر گئے تو وہ اپنی ننھیال میں رہنے لگے اور وہاں زندگی بڑے عیش سے گزرنے لگی۔ کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی اس لیے مرزا جوانی کی راہوں میں بھٹک گئے مگر رفتہ رفتہ سدھر گئے۔ بہت ہی کم عمری میں ان کی شادی الٰہی بخش کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی۔ اسوقت مرزا کی عمر تیرہ[۱۳] سال کی تھی اور ان کی بیوی کی عمر گیارہ سال۔ غرض مرزا شادی کے بعد دلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔

شادی کے بعد مرزا بے دریغ خرچ کرنے لگے آمدنی محدود تھی مگر اس کے باوجود وہ نہایت فراخدلی سے خرچ کرتے۔ وہ ہر ایک کی مدد کرتے دوسروں کو کھلاتے اور خود بھوکے رہتے۔ کسی کی خواہش کو رد نہیں کرتے تھے۔ اس لئے مرزا قرض کے بوجھ سے دبتے ہی گئے جس سے چھٹکارا ملنا مشکل ہوگیا۔ اس زمانے میں ان کو پنشن ملنا بھی بند ہوگئی۔ مرزا نے صبر و ضبط سے کام لیا ہمت نہ ہارے دوبارہ پنشن منظور کرانے کے لئے مسلسل پندرہ سال کوشش کئے مگر ان کی کوشش بیکار گئی جب مرزا بہت پریشان ہو گئے مالی پریشانیوں کے سبب مرزا کا حال ابتر تھا۔ غدر کے زمانے میں مرزا کی بیوی اپنا قیمتی اثاثہ محفوظ رکھنے کے لئے مرزا کالے خاں کے حوالے کیا گیا مگر ان کا گھر بھی اس ہنگامے کی لپیٹ میں آگیا اور رہا سہا اثاثہ بھی لٹ گیا۔

مرزا تھوڑے ہی دن سکھ اور چین سے بسر کئے بعد بعد ان کو بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض وقت وہ اپنی پریشانیوں سے تنگ آکر کسی بادشاہ کے ہاں ملازمت کر لینا چاہتے مگر ان کی خودداری ان کی راہ روکے رہی لیکن جب ان کی مشکلیں قرض داروں کا تقاضا اور فاقہ کشی سے تنگ آکر آخر میں دشمنوں کے شورے سے قلعے کی ملازمت کرنے کی ٹھان لی۔ ان کا تھوڑا بہت قلعے سے تعلق تھا وہ صرف عید یا کسی شادی بیاہ کے موقع پر قصیدہ یا قطعہ لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے مگر کبھی وہ مستقل طور پر ملازم نہ رہے تھے مگر مجبوراً اپنی غریبی سے تنگ آکر قلعے کی ملازمت کر لی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق کو باریابی حاصل

تھی کیونکہ ظفر ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کو باریابی حاصل ہوئی۔ غالب پہلے مہر نیمروز لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے۔ بادشاہ بہت پسند فرمائے۔ مرزا نصیرالدین عرف کالے میاں بہادر شاہ ظفر کے خاص پیر و تھے اور مرزا غالب کے نہایت دوست۔ ان کے توسط سے مرزا کو قلعے کی ملازمت مل گئی۔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے مرزا کی فراست اور قابلیت دیکھ کر ان کو نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کا خطاب عطا کیا اور ماہانہ پچاس روپے اور خلعت فاخرہ دربار سے باقاعدہ ملنے لگے ان کے عوض میں انکو افتخار الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا کام ملا۔

اس زمانے میں قلعے کا دستور تھا کہ تنخواہ ۶ ماہ میں صرف ایک وقت دی جاتی تھی۔ مرزا تو نہایت تنگدستی سے زندگی گزارتے تھے اگر تنخواہ چھ ماہ میں ایک وقت ملے تو کیونکر گزارہ ہوگا وہ پھر قرضہ لے کر زندگی گذارنے لگے پھر انکو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس لئے وہ کہہ دئے کہ اگر تنخواہ ماہ بہ ماہ نہ ملی تو قلعے کی ملازمت سے دست بردار ہوجاونگا حالانکہ وہ قلعے کی ملازمت سے خوش تھے۔ جیسے بھی ان کا خرچ چلتا مگر اتنی دیری سے تنخواہ ملنے پر وہ مجبور تھے۔ اس شعر سے انکی دلی کیفیت اور مالی پریشانیوں کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۔ آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ ۔ تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس ۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس کے بعد آپ کو ہر ماہ تنخواہ ملنے لگی۔ وہ ایک زمانے تک تاریخ نویسی کے کام پر متقرر رہے۔ ذوق کے مرنے کے بعد غالب کی دربار میں بہت آنگ ہوئی۔ ظفر اپنے کلام کی اصلاح لینے لگے اور بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے مرزا خضر سلطان بھی انکے شاگرد ہوئے اور اسی سال خوبیٔ قسمت دیکھئے مرزا کو واجد علی شاہ کے دربار سے بھی سالانہ پانچسو روپے مقرر ہوگئے اس کے بعد مرزا کی زندگی چین و سکون سے بسر ہونے لگی مگر مرزا کی زندگی میں سکون چین زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔ دو سال کے اندر کایا ہی پلٹ گئی پھر سے انکو روزی کی فکر دامن گیر ہوئی اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں غدر ہوگیا۔ اس میں بہادر شاہ کا خاندان تباہ ہوگیا اور بہادر شاہ ظفر رنگون بھیج دئیے گئے۔

غدر کے دنوں میں کہیں آنا جانا بالکل ترک کر دئے تھے صرف اپنے گھر میں بند پڑے رہے۔ غدر کے بعد بہادر شاہ ظفر کا دربار رک گیا اور قلعے کی ملازمت چھوٹ گئی پھر سے مرزا اندھیرے میں بھٹکنے لگے۔ "دستنبو" ان کی کتاب جس میں غدر کے بعد کے تمام حالات درج ہیں۔ غدر کے بعد مرزا کو بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ روزی کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے مگر کہیں امید بر نہیں آتی تھی غرض مرزا اسطرح اپنی پریشانیوں سے تنگ آکر قلعے کی ملازمت اختیار کی مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ وسیلۂ معاش بھی جاتا رہا اور قلعے کی ملازمت ختم ہوگئی۔

انیس جہاں نور
بی اے (سال اول)

غالب اور علی گڑھ

غالب ہمارے ملک کے عظیم شاعروں میں سے ہیں۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف نثر ہمارا بہت بڑا ورثہ ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب کا شمار ان شخصیتوں میں ہے جنہیں ہم اعتبار سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کا علامہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کا مسلک رنگ و نسل مذہب و ملت اور ذات پات کی قید سے علیحدہ اور بلند ہو کر ساری انسانیت کو ایک رشتۂ یگانگت میں لانا تھا۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس گہری عقیدت کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو غالب کے زمانۂ حیات سے آج تک علی گڑھ کو غالب اور ان کے کلام سے رہی ہے۔ اس سے اُس ذہنی رابطہ کا راز بھی سمجھ میں آ جائے گا جو علی گڑھ اور غالب کے درمیان شروع سے چلا آ رہا ہے۔

ارباب علم و فن کو غالب سے بہ حیثیت شاعر۔ بہ حیثیت شخص، بہ حیثیت علامت اور بہ حیثیت ادیب متعارف کرنے کا مشکل و محترم کام سب سے پہلے علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے برگزیدہ رفیق کار اور اردو کے سب سے شریف اور دردمند شاعر و نقاد مولانا الطاف حسین حالی نے انجام دیا۔ ان کے بعد کالج کے دو نامور فرزندوں ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کی اہمیت و عظمت کو نقد و نظر کے جدید طریقوں سے اپنی تصانیف اور تحریروں میں بتایا۔ ان مقالہ نگاروں کے بعض نظریوں اور نتائج سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان مقالات کے قابل قدر ہونے میں کلام نہیں۔

غالب کا اردو دیوان سب سے پہلے سر سید کے بھائی سید محمد خاں بہادر مالک مطبع سید المطابع و سید الاخبار نے ۱۸۴۱ء میں اپنے مطبع سے شائع کیا۔ سر سید کی کتاب آثار الصنادید (۱۸۴۷-۱۸۴۶ء) سب سے پہلی کتاب ہے جس میں غالب کے حالات و کلام پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جو ستر صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

انجمنِ ترقی اردو نے ۱۹۱۶ء میں دیوانِ غالب کا ایک نہایت صحیح اور خوبصورت ایڈیشن تیار کیا۔

جس کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا۔

غالب کے مزار کو گمنامی اور شکستہ ریخت سے بچانے اور لے غالب کے شایانِ شان ایک یادگار کی شکل میں منتقل کرنے کی اپیل سب سے پہلے علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے اور ہندوستان کے مسلم لیڈر مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہور اخبارات ہمدرد اور کامریڈ میں بڑے شد و مد سے کی تھی۔

غالب کے اردو کلام کا نہایت خوبصورت جیبی اڈیشن نکالنے کا سہرا علی گڑھ کے دوسرے اولڈ بوائے سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور موجودہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سر ہے۔ جب وہ ۱۹۲۵ء میں جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ اڈیشن نہایت حسین جلد و جدول اور نفیس نسخ ٹائپ میں طبع شرکت کاویانی برلن سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

جس طرح اردو کے محسن و مستند مصنف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے علیگ کی سعی و شوق سے انجمن ترقی اردو کے دورِ اول میں شائقین اردو کو کلامِ غالب جدید نقطۂ نظر اور اصول تنقید سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ اور اسی طرح انجمن ترقی اردو کے دورِ ثانی میں مشہور صاحب طرز و صاحب قلم قاضی عبدالغفار صاحب علیگ کی سعی و کوشش سے شائقین اردو کو غالب کی شاعری، شخصیت اور زندگی کے مختلف زاویوں سے روشناس ہونے کا سامان فراہم ہوا۔

جب پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ذکر آتا ہے تو ساتھ میں علی گڑھ کا خیال بھی آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کبھی نہ جدا ہونے والے نام بن گئے ہیں۔

رشید صاحب نے غالب پر بہت کچھ کہا ہے اور لکھا بھی اگر وہ کچھ نہ لکھتے تو وہ غالبیات میں اسی طرح شہرت بقائے دوام حاصل کرتے جس طرح حالی نے حاصل کیا۔ ان کا یہ کہنا کہ "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔ غالب۔ اردو۔ تاج محل۔ یہ جملہ بہت سی کتابوں پر بھاری ہے

غالب نے اردو شاعری کو وزن اور وقعت دینے کے علاوہ ایک لب اور ایک روایت بھی دی جن سے ہماری زبان اس قابل ہوئی کہ وہ شاعری کے ان مشکل لیکن اہم مطالبات سے بھی عہدہ برآ ہو سکے جن کے بغیر وہ غزلیہ شاعری کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

سرسید اور حالی کے بعد علی گڑھ سے غالب پر لکھنے والوں میں بہت سے نام ہیں جن میں قابل ذکر ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالغفار، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا سہیل، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مجنوں گورکھپوری ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر عبداللہ غازی شکیل، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری وغیرہ۔

مختصراً یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب شناسی کا ذوق علی گڑھ نے پیدا کر دیا تھا [illegible] چنانچہ گذشتہ بیس پچیس سال میں غالب پر طرح طرح کی مستند تصانیف

مقالے، اور ان کے دیوان کے دلکش ایڈیشن (مصور) شائع ہوئے جن میں عبدالرحمٰن چغتائی، غلام رسول، امتیاز علی عرشی، شوکت سبزواری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر سید مبارز الدین رفعت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ غالب صدی بڑے شاندار پیمانے پر ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ممالک میں منائی جا رہی ہے۔ ہماری زبان ۸ر فروری ۱۹۶۹ء سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی ایک شاندار پروگرام بنایا ہے جس کے مطابق مارچ کے وسط میں ایک سیمینار، ایک نمائش اور ایک مشاعرہ ہوگا۔ اور علی گڑھ میگزین اور فکر و نظر کا غالب نمبر پیش کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ غالب پر کئی کتابیں بھی جلد ہی پیش کی جائیں گی۔ انجمنِ ترقی اردو ہند نسخہ عرشی کا نیا ایڈیشن، فارسی خطوط غالب کا اردو ترجمہ اور غالب کے غیر متداول کلام کی شرح شائع کر رہی ہے۔ (ماخوذ)

جناب سید ابراہیم پاشاہ لطفی نقشبندی
کولاری

غزل

فقط اک تذکرہ رہتا ہے بزمِ باغبانوں میں
کہاں ہیں آج وہ اگلی بہاریں بوستانوں میں

کہاں یارب ٹھکانا مل سکے گا گلستانوں میں
ہزاروں بجلیاں پوشیدہ ہیں ان آسمانوں میں

ہر اک تنکا چمن کا کہہ رہا ہے اب عنادل سے
مقید برق کو کر لو تم اپنے آشیانوں میں

کوئی تیرے تجسس میں نہ پہنچا اپنی منزل پر
محبت میں ہے مشکل کامیابی امتحانوں میں

حریمِ ناز کے پردے بہت ہی جلد اٹھ جاتے
اگر تاثیر ہوتی اہلِ الفت کی فغانوں میں

نہ وہ دل ہے۔ نہ وہ آنکھیں نہ کوشش ہے۔ نہ محنت ہے
کہاں باقی ہے احساسِ جوانی نوجوانوں میں

بنا ہے رہنما جب ذرہ ذرہ تیری منزل کا
ہمارا کارواں آگے رہے گا کاروانوں میں

ذرا ٹھہرو، نگاہوں سے نگاہیں کیوں ملاتے ہو
سنبھلنے کی نہیں طاقت تمہارے نیم جانوں میں

ستم کی لذتوں ہی میں مجھے رہنے دو اے لطفی
کہ ممکن ہے شمار اپنا ہو اُن کے قدر دانوں میں

نسیمہ بیگم۔ پی۔ یو۔ سی

غالب کے متفرق اشعار

تو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پہ نہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

نورالحق سلیم
ایم اے (سال اول)
میسور یونیورسٹی

غالب کا فلسفہ

جناب ابو محمد سحر لکھتے ہیں۔

"شاعری کا تعلق جذبات سے اتنا گہرا ہے کہ جب تک شعر جذبہ کی آنچ میں تپ کر نہ نکلا ہو اس وقت تک تخیل اور بیان کی کرشمہ سازیاں اکثر بے جان معلوم ہوتی ہیں لیکن شاعری میں جذبہ کی کارفرمائی ہمیشہ ایک سیدھے سادھے بیانات طریقہ پر نہیں ہوتی بلکہ تخیل کا پرتو اس کو پیچیدہ اور رنگین بنا دیتا ہے۔ تخیل کی رہنمائی میں جذبہ جن منازل سے گزرتا ہے ان میں سے ایک منزل غور و فکر کی بھی ہے۔ اور یہیں سے شاعری میں تفکر اور تعقل کی اہمیت شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ تفکر و تعقل شاعری کے لئے ناگزیر نہیں لیکن جب شاعر فلسفہ کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں وزن اور بلندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں فلسفہ کے جلوہ گر ہونے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کبھی شاعر کا کلام صاف طور پر ایک نظام فکر کا حامل ہوتا ہے کبھی اس کے خیالات کے تانے بانے سے ایک نظام فکر ترتیب دیا جا سکتا ہے اور کبھی فلسفہ سے مراد حیات و کائنات کے بارے میں چند ایسی باتوں یا ایسے زاویہ نگاہ سے ہوتا ہے جس میں فلسفیانہ عمق اور گہرائی پائی جاتی ہے۔"

غالب کا رجحان طبع فلسفیانہ تھا۔ اس لئے نقادانِ فن نے ان کو اردو زبان کا سب سے پہلا فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔ ہمیں غالب کے کلام میں تغزل کے علاوہ فلسفیانہ حقائق و معارف بھی ملتے ہیں یعنی حیات اور کائنات سے متعلق مسائل پر ان کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر شاعرانہ انداز میں ملتا ہے۔ ان کے کلام کی فلسفیانہ حیثیت کے بارے میں متضاد رائیں دی گئی ہیں۔ کسی کا قول ہے کہ "غالب کا ایک فلسفہ ہے" کوئی رقم طراز ہیں کہ "کوئی فلسفہ نہیں" کسی کو وہ رجائی معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے نقطۂ نظر میں وہ قنوطی ہیں۔

ایک جگہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں "غالب اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں"

شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

"جب مرزا نے اپنے ذہن کو اپنی دلی کیفیات اور حیات انسانی کی کشمکش بیان کرنے کے لئے استعمال کیا تو ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آگئے لیکن ان کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہیں تھا محض دل پر گذری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مقصود تھا۔" (حکیم فرزانہ)

ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں۔

غالب نے فطرت اور کائنات کے مطالعہ کے بعد اپنے نظریات قائم کئے تھے۔ (فلسفہ کلام غالب)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

"غالب نہ فلسفی تھے نہ صوفی، ان کا سارا فلسفہ اور تصوف ان کی فکر روشن کی کرشمہ سازی ہے۔"
(نئے پرانے چراغ)

غالب فلسفی شاعروں کے اس زمرے سے بالکل خارج ہیں جن کا کلام صاف طور پر ایک نظام فکر کا حامل ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کا مقصد نہ فلسفہ طرازی تھا اور نہ انہوں نے کہیں اس کا دعویٰ کیا ہے۔ غالب ایک بہترین غزل گو شاعر تھے، وہ ایک فلسفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کا ذہن ہر بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

غالب نے اپنے کلام میں طرح طرح سے خدا کی ہستی، کائنات کی حقیقت اور مادہ اور روح کے تعلق وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ غالب نے تصوف کے علاوہ کوئی فلسفہ ایسا نہیں پیش کیا جس کو مرکزی حیثیت دی جا سکے۔ غالب وحدت الوجود کے سخت قائل ہیں۔

غالب کے نزدیک دنیا ایک بے حقیقت اور بے ثبات چیز ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں، اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ دنیا کی کسی چیز پر اعتماد کر کے افتخار محسوس کرنا دانشمندی نہیں، عام طور پر وہ دنیا کی بے ثباتی کا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی اسے چھوڑنا دل سے پسند نہیں کرتے بلکہ بے فکری کے ساتھ زندگی کے لمحات مختصر کو مسکراہٹوں اور قہقہوں میں گھول دینا چاہتے ہیں۔ غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کی رائے میں حقیقی وجود صرف ایک ذات کا ہے جس کے مجموعۂ مظاہر کا نام "عالم" یا کائنات ہے۔ ان کے جذبات میں بناوٹ اور آورد کی آمیزش نہیں ہے۔ بلکہ ان کی ذاتی اور قلبی کیفیات کا اثر اور رنگ ہے وہ جس چیز کو محسوس کرتے ہیں اسی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں خلوص اور تاثیر اسی حیثیت سے موجود ہے جس طرح ایک راست باز انسان کی بات میں ہونی چاہیے۔

ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ ہے۔

تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں، زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور

ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی ہر چند کہ وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں عالم بیرنگی میں گزر پاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم دونوں، اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر شہور نہ ہوئے ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔"

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب دنیا کو بے ثبات ناپائدار سمجھتے ہیں اور جو چیزیں دنیا میں موجود ہیں جن کی رنگینی اور رعنائی نے اس بے رنگ خاکے میں رنگ بھر کر اسے حد درجہ دلکش اور نظر فریب بنا دیا ہے وہ بھی سب بے حقیقت ہیں۔

غالب کا مسلک یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر علائق دنیا سے رہائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں جس قدر آرام مل سکے حاصل کیا جائے۔ جتنی لذتیں اور نعمتیں ہاتھ آ سکیں ان سے لطف اٹھایا جائے۔ مگر بالکل اس انداز سے جیسے مکھی شکر پر بیٹھتی ہے اور اڑ جاتی ہے

درد ہر فرو رفتہ لذت نتواں بود
برقند نہ بر شہد نشیند مگس ما

زندگی میں غم ایک بنیادی حقیقت ہے۔ بلکہ ہستی یا حیات اور غم ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں۔

"غالب نے زندگی اور غم کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے (اردو غزل)

غالب کی رائے میں آدمی دنیا میں رہ کر غم و آلام سے نجات حاصل نہیں کر سکتا، غم باہر سے نہیں آتا اس کے اندر سے ابلتا ہے اس کی فطرت کی گہرائی سے غم کے سوت پھوٹتے رہتے ہیں۔

قفس و دام رگ گل ہے نیست
ریختن در نہاد بال و پرست

غم و آلام اور زندگی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔

قید حیات بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی کا تصور خواہش کے تقیہ پر مبنی ہے۔ غالب نے اس تیہ کو ہی ختم کر دیا ہے حالانکہ یہ زندگی اور حیات سے رابطہ ہے۔ اس کا انکار زندگی کا انکار ہے۔ غالب غم روزگار سے تنگ آکر موت کی آرزو کرتے ہیں۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

غالب زندگی کے آلام سے بیزار اور شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

زندگی میں غم سے کسی کو مفر نہیں ہے اور غم زندگی کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ انسان زندگی میں کسی نہ کسی غم میں مبتلا رہتا ہے۔

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا۔ غمِ روزگار ہوتا

جب ایک انسان پر مصائب و آلام کا نزول پے در پے ہوتا ہے تو وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے یعنی پھر اسے ان سے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ غالب فرماتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ایک جگہ غالب موت ہی کو غم ہستی کا مداوا بتلاتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آدمی بظاہر ایک حقیر شئے ہے لیکن دراصل ساری کائنات بطرز اجمال اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اگر وہ تنہا بھی ہو تو خیالات کی ایک دنیا اس کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے اس کی خلوت میں بھی جلوت کا رنگ مخفی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

انسان کو چاہیے کہ اپنی نظر کو بلند رکھے کیونکہ خدا نے اپنی نوازشات کو کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ابو محمد سحر لکھتے ہیں۔

غالب کے فلسفہ کو قنوطیت اور رجائیت کے خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ قنوطیت اور رجائیت اپنے فلسفیانہ مفہوم میں دو انتہا پسندانہ نظریے ہیں۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اتنے بیگانگی ہیں کہ حقیقت کی کسی قابل قبول تعبیر کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی۔ فلسفیانہ مفہوم سے قطع نظر کر کے قنوطیت اور رجائیت کا تعلق افتاد طبیعت سے سمجھا جاتا ہے اور یہاں بھی نا امیدی اور امید و غم اور خوشی کی ایک بیگانگی تقسیم روا رکھی جاتی ہے۔ غالب اس معاملے

ہیں، واقعیت پسند تھے۔ ان کے یہاں غم بھی ہے اور خوشی بھی یاس بھی ہے اور امید بھی اور مجبوری جیثیت سے ایک ایسی توانائی ہے جو رجائیت سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگر اند
روز روشن بو داغ شب تا آمد و رفت

غالب کے خطوط بھی جن کے آئینہ میں ان کی توانا اور باغ و بہار شخصیت شاعری کے مقابلہ میں زیادہ روشن ہے۔ انہیں نتائج پر پہنچاتے ہیں۔ اقبال نے اپنی ایک نظم میں غالب کیلئے کہا ہے

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

"غالب کے تخیل کی رسائی ان کے فلسفیانہ مزاج کی دین تھی۔ اور ان کی عظمت کا اعتراف اس سے بہتر طریقہ پر ناممکن ہے"۔

غزل

شمیم خانم شمیم
بی ایس سی (سال سوم)
نائب صدر بزم ادب

جب بھی وہ مسکرا کے چلتے ہیں
ایک قیامت اٹھا کے چلتے ہیں

دل پہ صدمے اٹھا کے چلتے ہیں
اہلِ غم غم بھلا کے چلتے ہیں

خاکساروں کی یہ نشانی ہے
اپنی گردن جھکا کے چلتے ہیں

حسن والے رلا کے غیروں کو
آپ خود مسکرا کے چلتے ہیں

زندگی ساتھ ان کا دیتی ہے
زندگی جو مٹا کے چلتے ہیں

کتنے بیدرد ہیں یہ گلچیں ابھی - خون گلوں کا بہائے چلتے ہیں
کتنی بیتاب ان کی آنکھوں میں - تیر اکثر قضا کے چلتے ہیں

غزل

(شاہین زہرہ - بی ایس سی (سال سوم) مدبرہ)

اقرار زبانی کر کے کہیں انسان مسلماں ہوتے ہیں
علم و عمل کے نور سے ہی دل پیکرِ ایماں ہوتے ہیں

کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں نظارہ کئی طوفانوں کا
جو ٹکرا جائیں طوفاں سے وہ انساں انساں ہوتے ہیں

غم اور الجھن کے اندھیروں میں جب کوئی گھر جاتا ہے
آفات میں ایسی اس کے جوہر اور نمایاں ہوتے ہیں

کہتے ہیں جسے ہمدردی اس چیز سے دنیا خالی ہے
یوں اس کی تلاش و تمنا میں بیکار پریشاں ہوتے ہیں

اپنے کئے پر عرصے بعد خود آپ پشیماں ہوئے تو کیا
جڑ جائیں ٹوٹ کے کہیں وہ دل کے شیشے ہوتے ہیں؟

دستورِ ستم پر دنیا کے حیراں نہ ہو شاہین ہرگز
پنہاں ہو کرم میں جن کے ستم ایسے بھی مہرباں ہوتے ہیں

خالدہ بانو
(بی ایس سی سالِ اول)

غالب کی مشکل پسندی

غالب اردو زبان کے واحد شاعر ہیں۔ جو صرف اپنی ذہنی انتشاروں اور کشمکش زندگی کے باوجود ادب میں سب سے بلند اور دائمی مقام رکھتے ہیں۔ جدید نقادوں کا خیال ہے کہ غالب جیسا شاعر اردو میں جنم لینا اب مشکل۔ ان کے مختلف النوع خصوصیات کے اکثر موضوع سخن ایک مستقل عنوان کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف غالب کے مخصوص کا ذکر کریں گے یعنے غالب کی مشکل بیانی

غالب کی مشکل بیانی۔

غالب نے ابتداء میں اردو کی طرف قطعی توجہ نہیں دی اور جب شعر شروع میں اس طرف مائل ہوئے تو اس کم مایہ زبان کو اپنے اظہار خیال کے لئے ناکافی محسوس کیا۔ کیونکہ فارسی میں وہ بڑے سے بڑے فارسی داں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس لئے ابتداء میں انہوں نے جو شعار کہے ان کو کسی نے خاص اہمیت نہ دی۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہو۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہندوے زلف کے ہے پاس سدا مصحفِ رخ
عہد میں تیرے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

غالب کو خود بھی اپنے مشکل کلام کا احساس تھا۔ چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں ۔

مشکل زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

سب لوگوں نے انہیں بہت پریشان کیا اور ان کا مضحکہ اڑا اڑا کر ان کے کلام کو لغو اور بے معنے قرار دیا۔ مثلاً

اگر اپنا کہا خود آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

تو مرزا غالب مجبوراً ان لوگوں کو جواب دیتے ہیں ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب کا سب سے بڑا کمال شاعری ان کا تغزل ہے۔ اور وہ اپنی غزلیات اور ندرتِ خیال کی وجہ سے ادب میں ایک خیر فانی مقام رکھتے ہیں۔ عشق و حسن کی واردات ۔ وصل و ہجر کے قصے۔ عشق ۔ محبت کا تصور۔ غرضیکہ ہر بات کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں ۔ خواہ وہ معشوق سے باتیں کریں نہ کریں یا شکوہ و شکایت ۔ چاہے معشوق کی جفاؤں کا رونا ہو۔ یا اس کی عنایتوں کا عقیدہ وجو بھی بیان کرتے ہیں عجیب انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

غرض غالب کے کلام میں اس قسم کے سینکڑوں اشعار ملتے ہیں جو جدتِ بیان اور ندرتِ خیال کی وجہ سے بے مثل ہیں ۔ اور اپنے لئے ایک علحدہ عنوان تلاش کرتے ہیں۔ غالب کی رقابت بھی قابلِ رشک ہے۔ اُن کی بذلہ سنجی اور شوخ مزاجی ایک علحدہ مقام کی حامل ہے۔ اسی لئے غالب کو بے پناہ خصوصی فاصد کا مجموعہ سمجھئے اور ان کے کلام کو ایک بحرِ بیکراں کہیے ۔

غالبؔ کی جدّت پسندی

اردو شاعری کے بعض موضوع ایسے ہیں جن پر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً لذتِ وصل۔ فراق کی تکلیفیں۔ معشوق کا غرور۔ رقیبوں کی دشمنی۔ اغیار کا طعنہ اور ناصح کی خوشامد وغیرہ۔ گویا یہ موضوع اردو شاعری کے ایک اہم جز بن کر رہ گئے ہیں۔ غالبؔ نے بھی ان مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے مگر اپنی جدّت طبع اور ندرتِ بیان کے ساتھ وہ بیدلؔ اور میرؔ کی شاعری کے شیدائی ضرور تھے اور ان کے کلام میں انکی تقلید بھی نظر آتی ہے مگر غالب کی جدت بیانی اکثر ان حضرات سے سبقت لے گئی ہے۔

دنیا کا کوئی بڑا شاعر بغیر تقلید و اولیت کے اپنا مقام نہیں حاصل کرسکا۔ مگر ادبی دنیا کا یہ عظیم کرشمہ ہے کہ جتنے عظیم الشان شاعر و انشاپرداز زمانے میں ہوئے وہ اپنے متقدمین یا معاصرین کی کسی نہ کسی طرح تقلید کے بعد خود بھی ایک صاحب طرز اور نئے اسلوب کے مالک بن گئے اور ادب میں بہت بلند مرتبہ کے حامل قرار دئے گئے۔ یہی معاملہ غالب کے ساتھ ہے کہ انہوں نے میرؔ اور بیدلؔ سے بظاہر استفادہ کیا مگر بعد کو خود ایک نئی طرز ادا کے مالک و بادشاہ بنے۔ غالبؔ نے دراصل غزل کا رخ ہی موڑ دیا۔ غالب کی طبیعت میں اجتہاد تھا۔ چنانچہ روشِ عام سے ہٹ کر غالب نے غزل میں نئے نئے گوشے نکالے۔ شوخی، شگفتگی اور متانت سے غزل کو مالا مال کیا۔ ایک ایک شعر میں بڑے بڑے عمیق مضامین پنہاں کر دیئے۔

غالبؔ کی جدت بیانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی اور حقیر چیز کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت اور مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شعر میں وہ مٹی کے کوزے کی حیثیت جامِ جم سے اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ انسان کو حقیقی معنوں میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

غزل کے دوسرے شعرا نے بھی اس فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ مگر غالب کی جدت پسندی کا مقابلہ ذرا کیجئے مثلاً مومنؔ جیسا باکمال شاعر جسے شہنشاہ متغزلین کہلانے کا فخر حاصل ہے رنج والم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب اسی مضمون کو ان الفاظ میں باندھتے ہیں۔

ع قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کی جدتِ طبع کا اندازہ اس شعر سے کیجئے ۔ یعنی جب وہ کسی دیوار میں خم دیکھتے ہیں تو اُن کا تخیل ان کو اس طرف لے جاتا ہے کہ یہ مزدور کے احسان کا بوجھ نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے جھک گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

غالب کا عشق و رشک سے بڑھ کر حسد کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے ۔ یہ بھی نہیں چاہتے کہ لوگ میرے زخمی ہونے پر میری پرسش کو آئیں کیونکہ جس طرح ان کا رازداں ان کے منہ سے معشوق کا ذکر سننے کے بعد ان کا رقیب بن گیا ۔ اس طرح ان کے دوست احباب بھی ان کے زخموں کو دیکھ کر معشوق کو برا بھلا کہیں گے ۔ گو کہ وہ اُن پر ترس کھائیں گے مگر غالب اس کو بھی پسند نہیں کرتے ۔ کیونکہ انہیں خوف ہے کہ کہیں یہ لوگ معشوق کی طرف مائل نہ ہو جائیں ۔ دیکھئے اس رشک کو غالب کس جدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

آخر میں ایک اور شعر ملاحظہ کریں ۔ جس سے غالب کی جدت پسندی ندرتِ طبع کا خاصہ اندازہ لگتا ہے ۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

حبیب النساء
بی ۔ اے (سالِ اول)

غزل

جذبات و تصور کا محل بھیج رہی ہوں
اے جانِ غزل تجھکو غزل بھیج رہی ہوں

دل بھیج رہی ہوں نہ کنول بھیج رہی ہوں
اک عشق کی تصویرِ مسلسل بھیج رہی ہوں

میں تیری جفاؤں کا بدل بھیج رہی ہوں
یعنی شجرِ عشق کا پھل بھیج رہی ہوں

اے دوست پئے شمعِ شبستانِ تمنا
پروانۂ فانوسِ اجل بھیج رہی ہوں

ٹکڑے ہیں جگر دل کے جو کاغذ پہ چھپے ہیں
کہنے کو تجھے ایک غزل بھیج رہی ہوں

یہ میری محبت ہے کہ پتھر کے صنم کو
رہنے کے لئے شیش محل بھیج رہی ہوں

اُس چشمِ فسوں گر کے لئے دل میں حبیب اب
پژمردہ و افسردہ کنول بھیج رہی ہوں

ثریا جان نشاط
بی اے (سالِ دوم)
مدیرہ

غزل

اب کے آہوں نے کچھ نہ کام کیا
ہم نے ان کو کبھی نہ رام کیا

فطرت اسکی تھی ایسی کیا معلوم ۔ ننگ ہم کو ہر ایک کام کیا

وہ شبِ انتظار کا عالم ۔ سوزِ کو غم سے ہمکلام کیا

ایک رہِ وفا میں ہم نے تو ۔ سجدۂ نقشِ قدم پہ عام کیا

شوق خانہ خراب کیوں رکھتا ۔ رسمِ الفت کا احترام کیا

کیسے گذری نشاط مت پوچھو ۔ روتے روتے صبح کو شام کیا

رفیعہ مہکری
بی۔ اے (سال دوم)
معتمد بزم اردو ادب

غالبؔ کا اندازِ بیاں

پتہ نہیں اس کارگاہِ عالم میں پیدائش و موت کا عمل کب سے جاری ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہے گا۔ ہر طلوعِ صبح کے ساتھ نہ جانے کتنے جامہ ہستی سے آراستہ ہو کر سطحِ ارض پر قدم رکھتے ہیں اور لتنے تارِ ہستی کو شکست کر کے آغوش فنا میں جا چھپتے ہیں۔ یہ عمل ہر لحہ برسرِ کار ہے۔ پیدا ہونے والوں میں ہر قسم کے لوگ اس دنیا میں آکر اپنے افکار و اعمال کے ڈنکے بجا کر چلتے بنے ہیں مگر ان کی دکھائی ہوئی شاہراہیں ارباب دنیا کے لئے غور و فکر کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسی ابدی اور یکتائے زمانہ ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کا ظہور صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے اور جب ایسی ہستیاں ابھرتی ہیں تو علم و ادب کی نئی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔

مرزا غالبؔ بھی ایسے ہی نادرہ کار فن کاروں میں یگانہ دکھائی دیتے ہیں جن کی رعنائیِ خیل جدّتِ ادا اور حسنِ بیان نے شعر و ادب کو ایسی حیات بخشی جس کی آب و تاب کے سامنے مرزا غالب کے ہم عصر تاب نہ لا سکے۔ یوں تو شعر و ادب کے افق پر بے شمار ستارے ابھرے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں وہ روشنی کہاں جو غالب میں ہے کیونکہ غالب کی فکری پرواز جہاں پہنچتی ہے وہاں دوسرے شعرا کا گزر بھی نہیں ہوتا۔

مرزا غالب کا ابتدائی کلام الفاظ و معانی میں مشکل اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس پر معاصرینِ غالب نے اکثر ہنگامے برپا کئے مگر ما بعد ان کی نکتہ رس طبیعت نے کلام میں سادگی اور پرکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ جن کی روشنی رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

مرزا غالب ہی پہلا شاعر ہے جس نے اردو غزل کو نئے نئے مضامین سے بھر دیا اور فلسفہ و حکمت کا رنگ دے کر گہرائی اور گیرائی بخشی۔ ورنہ غالب کے عہد تک غزل گوئی برابر ایک ہی روش پر چلی آ رہی تھی وہی فرسودہ محاورے سیدھا سادھا روزمرہ مقررہ تشبیہات، استعارات ہجر و وصال کے پامال جذباتِ حسن و عشق وغیرہ۔ چونکہ مرزا غالب فطرتاً

ایک شوخ اور ندرت پسند طبیعت لے کر آئے تھے - اس لئے ان کو یہ داستان گوئی اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی - وہ شعر و سخن کے میدان میں ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوئے - انہوں نے غزل کو نیا لب و لہجہ اور نئے اندازِ بیاں سے آراستہ کیا - غالب کے دیوان میں بے شمار جلی عنوانات ہیں - طنز و ظرافت کو دیکھا جائے تو زعفران زار نظر آتا ہے گہرائی افکار کا مشاہدہ کیا جائے تو لا ثانی ہے - طرزِ ادا اور ندرتِ بیان پر روشنی ڈالی جائے تو ایک جہانِ نو کی سیر کا لطف حاصل ہوتا ہے -

مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت میں تو گنجائش کلام نہیں مگر ان کی نثر نگاری کا مرتبہ بھی ان کی شاعری سے کم بلند نہیں - ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جن میں گوناگوں کمالات و صلاحیتیں یکجا پائی جاتی ہوں - اگر کسی میں ملکۂ شاعری پایا جاتا ہے تو کسی کو نثر میں موتی بکھیرنا آتا ہے - کسی کا قلم جاندار ہے تو کسی کی زبانِ تیغ جوہر دار ہے مگر یہ غالب کی ہستی ہے کہ جہاں کمالات برابر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں - یعنی اگر وہ ایک طرف عظیم شاعر ہیں تو دوسری طرف اعلیٰ پایہ کے نثر نگار اور انشا پرداز بھی ہیں -

وہ ایک خاموش باغی تھے انہوں نے نامعلوم طور پہ غزل کی دنیا کو وسعت و جامعیت عطا کی - غزل ان سے پہلے (FANCY) کی بازیگری تھی انہوں نے اسے تخیل کی تازہ کاری اور لالہ کاری عطا کی - غالب کے خطوط نے ایک نئے دور کی ابتدا کی اور پرانی طرزِ تحریر کو خیر باد کہا - آنے والے ادیبوں نے غالب کے خطوط سے بہت کچھ سیکھا صفائی سادگی اور پُر خلوص پیرایہ اظہار -

---

شمیمہ نصرت
بی - اے - (سالِ دوم)

غزل

اگر ہوتا ہے کچھ ہوگا خوشی سے
نہیں پایا کسی نے بے رخی سے

فسردہ ہوگئی کھلنے سے پہلے
یہ کیا گل نے کہا ہوگا کلی سے

دل مضطر ہے اور آنکھیں ہیں پُر نم
یہ پھل پایا تمہاری دوستی سے

محبت کے مزے آئیں گے اس دم
گلہ جب خود کا ہوگا آپ ہی سے

خدائی کا لگا کرنے وہ دعویٰ
ہوئے جو تنگ تیری بندگی سے

تو اپنی راہ لگ جا رندِ بدمست
الجھتا ہے عبث کیوں شیخ جی سے

ہیں کیوں نصرت پھریرے اب اڑاؤں
نہیں مقصود شہرت شاعری سے

زرینہ پروین
(بی اے۔ سالِ اول)

دامِ خیال

ارے یہ تو غالب ہیں، ہاں غالب ہی ہیں .... وہی ہیں .... وہی لباس
... وہی ناک نقشہ ...... جو تصویر میں ہے ...... مگر ایک بال تک سفید نہیں ...... جوان ہو گئے ہیں ...
ہاں ہاں، شاید جنت میں رہتے ہیں ...... جنت میں کوئی بوڑھا نہیں رہتا ...... چلو ان سے بات کریں۔

سبزہ زار میں غالب کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے نکلا اور میں انکی طرف لپکی

"آداب حضرت" وہ کسی اور طرف دیکھ رہے تھے میری آواز سنتے ہی میری جانب مڑے۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے "جیتی رہو بیٹی، خدا تمہیں خوش رکھے۔

معاف فرمائیے حضرت! آپ غالب ہیں نا۔

ہاں میں غالب ہوں، اسد اللہ خاں غالب، تم نے مجھے کیسے پہچانا۔

میرے پاس آپ کی تصویر جو ہے، اور میں آپ کی کتابیں بھی پڑھتی ہوں'

"اچھا تو تم کون ہو بیٹی - کہاں رہتی ہو، کیا کرتی ہو؟

"میں مہارانی کالج میں پڑھتی ہوں حضرت"

"تو اب لڑکیاں بھی کالج میں پڑھتی ہیں"

"جی ہاں حضرت! ہمارے کالج میں فقط لڑکیاں پڑھتی ہیں"

"خوب، ہمارے عہد میں تو لڑکیاں گھروں میں پڑھتی تھیں ...... کہاں ہے یہ کالج تمہارا؟

"میسور میں ہے حضرت"

"اچھا تو یہ کالج میسور کی مہارانی نے بنایا ہے"

"جی ہاں - مہارانی نے بنایا تھا - مہاراجا نے مہاراجا کالج بنایا جہاں عموماً لڑکے پڑھتے ہیں۔

"میسور کے مہاراجا اور مہارانی! ہاں ہم نے بھی سنا تھا ان کا نام" مگر انہوں نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ خوب یاد آیا حیدرآباد میں بھی ایک مہاراجا تھے چندو لال، سنا تھا کہ سخنوروں کی قدر کرتے تھے۔ لکھنؤ سے حضرت آتش نے مجھے لکھا تھا کہ ان کے پاس حیدرآباد چلے جاؤ۔

"میں نے آپ کے خطوط میں پڑھا ہے حضرت! آپ حیدرآباد چلے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔"

"دلی چھوڑ کر دکن کون جاتا، وہاں تو قتیل اور شاہ نصیر کی استادی کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ مجھے اور ناسخ کو کون پوچھتا"

"مگر مہاراجا چندو لال آپ کی ضرور قدر کرتے"

"وہ بے چارے میری کیا قدر کرتے۔ میرے طرزِ سخن کی انہیں ہوا بھی نہ لگی تھی۔ وہ خود اسی سال کے ہو چکے تھے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ میرے وہاں پہنچنے تک مر جاتے، پھر میں کیا کرتا۔

"ہمارے مہاراجا ضرور آپ کی قدر کرتے حضرت، مگر ان کی زبان کنڑی تھی اردو ان کی زبان ہوتی تو وہ بھی آپ کے شعر و سخن کے معتقد ہو جاتے"

"اچھا تو یہ بات ہے، ٹھیک کہتی ہو ...... ہاں خوب یاد آیا۔ میسور میں ٹیپو سلطان بھی تو گزرے ہیں۔

"جی ہاں، ان کو تو انگریزوں نے شہید کر دیا تھا"

"ہاں ہاں، مجھے بھی یاد ہے۔ ان ظالم انگریزوں نے ہمارے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ کا چراغ بھی بجھا دیا تھا ...... ہائے کیا یاد آگیا وہ واقعات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ دلی میں قیامت آئی تھی ...... سو برس گزر چکے لیکن آج بھی اس کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے .... انگریز ...... یاد رکھو ...... مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

"مگر حضرت! آپ نے تو ان کی تعریف کے پل باندھے ہیں ...... ان کی مدح میں قصیدوں کے قصیدے کہہ ڈالے ہیں"

"ہاں ہاں ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتی بیٹی۔ وہ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ مجھے اس سے مفر نہیں، تم بھی اس زمانے میں دلی میں ہوتیں تو یہی کرتیں، ورنہ سولی پر لٹکنا پڑتا .... پنشن سے محروم رہنا ...... پھر کیا کھاتا"

"نواب صاحب رامپور اور آپ کے دوسرے شاگرد بھی تو آپ کی خدمت کرتے تھے حضرت"

"بے شک ان کی امداد ہی نے تو مجھے زندہ رکھا، لیکن بایں ہمہ دربار کی عزت بڑی چیز ہے، شاہی خاندان کا آدمی ہوں دربار و سرکار میں اعزاز و منصب کا متمنی رہا ہوں ...... اب ان باتوں کو جانے دو یہ تو بتاؤ کہ تم کیا پڑھتی ہو؟"

"حضرت! میں آپ کا دیوان بھی پڑھتی ہوں اور آپ کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلیٰ بھی پڑھتی ہوں"

"کیا کہا۔ اردوئے معلیٰ پڑھتی ہو، کہاں ہے وہ لائی ہو اپنے ساتھ؟"

"ہاسٹل میں رکھی ہے وہ کتاب، حضرت! اگر خبر ہوتی کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہوگا تو ضرور ساتھ لاتی"

"اسے دیکھنے کی آرزو ہی رہ گئی، ہماری زندگی میں مطبع سے چھپ کر نہ آئی۔ تم نے عودِ ہندی دیکھی ہے؟"

"جی ہاں دیکھی ہے حضرت"

"تو وہ پہلا مجموعہ تھا جو میرٹھ کے مطبع مجتبائی والوں نے چھاپا تھا۔ مگر بہت غلط چھاپا تھا۔ میں نے مزید خطوط جمع کئے اور دہلی کے اکمل المطابع والوں کے حوالے کیا کہ وہ دوبارہ اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع کردیں، اس کے چھپنے سے پہلے ہی ہم دنیا سے چل دئے"

"جی نہیں حضرت۔ اس کے علاوہ آپ کے خطوط کے اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔"

"خوب شاید اس کے بعد میرے اور خطوط بھی مل گئے ہونگے۔ کہیں کسی غیر کا لکھا ہوا خط تو مجھ سے منسوب نہیں کردیا گیا!"

"نہیں حضرت بالکل نہیں، کوئی اور آپ کا سا خط کیا لکھ سکتا ہے۔ آج تک اس طرز میں کوئی آپ کی برابری تو کجا نقالی بھی نہ کرسکا"

"ہاں بھئی۔ مجھے اس سے بڑی چڑ ہے میں نہیں چاہتا کہ کسی اور کا بچہ میرا بچہ کہلائے۔ کسی بے وقوف نے ایک غزل ہی مجھ سے منسوب کروائی تھی۔ کیا شعر تھا اس کا۔

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

توبہ توبہ یہ اور میرا کلام ہو۔

"آپ مطمئن رہیں حضرت۔ اب تک آپ کی نثر و نظم میں ایسی کوئی آمیزش نہیں ہوئی۔ شاید کبھی ہو سکے گی۔ آپ کا دیوان اور خطوط دونوں اپنے رنگ میں یکتا اور منفرد ہیں"

"ہاں، خدا تمہیں خوش رکھے، ٹھیک کہتی ہو لوگ اتنا سمجھ لیں تو مجھے اور کیا چاہیے، مجھے نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا!"

"حضرت! آپ نے مولانا حالی سے فرمایا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔

"ہاں ہاں کہا تھا، تو کیا ہوا!"

"ہم کہتے ہیں، اگر آپ اردو میں خطوط نہ لکھتے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرتے۔

"سبحان اللہ سبحان اللہ

"اور اگر آپ اپنے خطوط جمع کرکے شائع نہ کرتے تو اردو پر ظلم کرتے۔

"یہ کیوں؟

"اسلئے کہ آپ کے خطوط نے اردو نثر کی راہ بھی معین کی اور رہنمائی کا فرض بھی انجام دیا، آپ کے خطوط اردو نثر کی جان بھی ہیں اور شان بھی، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو نثر اگر آسمان ہے تو آپ کے خطوط اس کے چاند سورج اور تارے ہیں

"شاید تم مبالغہ کر رہی ہو بیٹی"

"بالکل نہیں حضرت! واقعہ عرض کر رہی ہوں آپ کے خطوط آپ کی سیرت اور شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کی شاعری سے زیادہ آپ کے خطوط کی بنا پر کہا جانا چاہیے کہ آپ خود ایک عہد تھے، ایک مزاج تھے۔ ایک علامت تھے۔ ایک عالم تھے۔

خدا تمہیں خوش رکھے۔

" ہمارے زمانے میں بھی ہمارے چاہنے والے ان خطوط کے بارے میں ایسی ہی تعریف اور تحسین کرتے تھے اور بات تھی بھی ایسی ہی میں شاعری پر اتنی توجہ نہ کرتا تھا جتنی نامہ نگاری پر بڑی پابندی سے خطوط لکھا کرتا تھا۔ اپنی زندگی میں بہت سے خطوط لکھے ہیں میں نے . . . . . مگر بیٹی ہمارے دیوان کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا؟"

" وہ بھی منفرد رنگ و کمال لئے ہے حضرت! آپ نے خود کہا ہے کہ آپ نے ایک نئی راہ نکالی ہے اردو غزل میں تو آپ نے نئی جان ڈال دی تھی اسے تہذیب کا درجہ بخشا۔ آپ کی سخن وری ہی کا فیضان ہے کہ اردو غزل آج اس عظمت و رفعت کی مالک ہے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا دیوان رہتی دنیا تک عالم انسانی سے خراج تحسین وصول کرتا رہے گا۔ اس کے سوا آپ کی شاعری کی تعریف کے لئے میں الفاظ کہاں سے لاؤں۔

" خوش رہو بیٹی جیتی رہو۔ تم نے آج میرا جی خوش کر دیا۔ ہمارے زمانے میں تو چند ہمارے حریف ہمارے کلام کو مشکل اور مہمل گردانتے تھے۔

" چند شعر بہت مشکل ہیں حضرت! شاید اس لئے کہا ہو گا۔

" شعر فہمی نہ آئے تو میں کیا کروں گا۔ بہر طور میں نے بھی چند دنوں کے بعد اپنا رنگ بدل لیا تھا . . . . . . مگر یاد رکھو میر نے مجھ سے پہلے اچھی غزلیں لکھی ہیں اور سودا۔ قائم۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش اور ذوق بھی شیوا بیان اساتذہ تھے استاد ذوق سے ہماری چشمک ضرور تھی مگر ان کا یہ شعر سن کر بڑا مزا آیا تھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مومن کا یہ شعر تو غضب کا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ شعر میرے سارے دیوان پر بھاری ہے۔

بے شک استاد ذوق قاقانی ہند تھے۔ قصیدہ کہنے میں ان کا جواب نہیں . . . . اچھا تو ہمارے خطوط اور ہمارا دیوان تمہیں کون پڑھاتا ہے

" ہمارے لکچرار پڑھاتے ہیں حضرت!

" لکچرار کیا معنے؟

" بس پروفیسر سمجھئے آپ کے زمانے میں تو پروفیسر ہی ہوتے تھے۔"

" کون ہیں تمہارے لکچرار"

خطوط پڑھاتے ہیں سید ابوتراب خطائی اور دیوان قیوم صادق پڑھاتے ہیں۔

"بڑے پیارے نام ہیں ان کے، ان کو ہمارا سلام کہنا"

"کسی زمانے میں دلی کالج کی پروفیسری مجھے پیش کی گئی تھی۔ سوار ہوگیا، بہت دیر انتظار کیا کہ پرنسپل ٹامسن صاحب استقبال کو آئیں گے۔ مگر وہ نہیں آئے، بہت دیر کے بعد آئے بھی تو کہنے لگے کہ آپ ملازمت کے لئے ہیں ملاقات کے لئے نہیں میں کیسے آپ کے استقبال کو آتا، میں نے بھی فوراً جواب دیا تھا کہ میں ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ میری عزت میں اضافہ ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کمی آجائے۔ ایسی ملازمت کو دور ہی سے سلام، یہ کہہ کر لوٹ آیا تھا"

"آپ پروفیسری کر لیتے تو اچھا تھا حضرت"

"کیوں"

"اب ہمارے زمانے میں آپ ہوتے تو آپ پروفیسر تو کیا لکچرار بھی نہ بن سکتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی"

"حضرت، لکچرار بننے کے لئے ام۔ اے۔ پاس کرنا پڑتا ہے اور پروفیسر بننے کے لئے ام۔ اے۔ کے بعد پی ایچ ڈی بھی کرنی پڑتی ہے۔"

"یہ پی ایچ ڈی۔ کیا بلا ہے"

"یہ تحقیق کی ڈگری ہے، ایسے آدمی کو ڈاکٹر کہتے ہیں"

"تو میں نے بھی تحقیق کی تھی برہان قاطع پر قاطع برہان لکھی۔ وہ تحقیق نہیں ہے"

"بے شک حضرت! لیکن اسے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کرنا پڑے گا۔ اور تین یا چار ممتحن اسے دیکھیں گے"

"کون ممتحن؟ یہی ہندوستان کے فارسی داں۔ توبہ۔ استغفراللہ۔ اب وہ فارسی جاننے والے ایران میں بھی نہ رہے نہیں مجھے نہیں چاہیے ایسی ڈگری۔"

"آپ پیش کریں گے تو بھی قبول نہ ہوگی حضرت۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں یہ سب کیوں کرتا۔ چھوڑو بھی ان باتوں کو . . . . اب اتنا بتاؤ کہ یہ عرشی، مالک رام اور آرزو کون ہیں! سنا ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔"

"ہاں ہاں حضرت! یہ بڑے لائق لوگ ہیں اور انہوں نے آپ پر بہت ساری کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔"

"خوب خوب"

"یہ عرشی امتیاز علی عرشی صاحب ہیں، مولانا آدمی ہیں بڑے عالم فاضل۔ رامپور کی لائبریری کے ناظم ہیں جہاں آپ کی اکثر اصل تحریریں موجود ہیں انہوں نے آپ ہی پر سب سے زیادہ اور سب سے اچھا کام کیا ہے۔"

"سنا ہے کہ بڑے نیک آدمی ہیں"

"عرض کیا کہ مولانا آدمی ہیں، اور یہ مالک رام بھی بڑے قابل بزرگ ہیں اور دلی میں رہتے ہیں۔"

" دلی میں ہماری دلی میں رہتے ہیں۔ بہت عزیز ہیں یہ مجھے۔" اور یہ مختار الدین آرزو علی گڑھ میں پروفیسر ہیں، یہ بھی بڑے قابل آدمی ہیں انہوں نے اور مالک رام نے مل کر بہت سارا کام کیا ہے اور ان دونوں کو ملا کر " مالک و مختار " کہتے ہیں۔

" واہ وا۔ سبحان اللہ۔ کیا خوب۔ ماشاءاللہ مالک مختار۔ مالک و مختار۔"

" حضرت! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اب آپ کی زندگی اور آپ کی نظم و نثر وغیرہ پر اتنی کتابیں مضامین نظمیں وغیرہ لکھی جا چکی ہیں کہ ان کی ایک لائبریری بن سکتی ہے، اور آپ کی نظم و نثر امتحانوں کے نصابوں میں شامل ہے۔ اگر آپ خود کسی امتحان میں شریک ہوں گے تو خود آپ کے بارے میں سوالات کے جوابات لکھنے کو وہ سب کچھ پڑھنا پڑے گا۔ جو آپ پر لکھا گیا ہے۔

" بڑے پتے کی بات بتائی بیٹی! یہ حقیقت ہے کہ آدمی خود کو نہیں جانتا دوسرے لیے جان سکتے ہیں، خود کو جاننا ہو تو خود سے الگ ہو کر دیکھا جائے۔ اور ہماری تمام عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

" اور حضرت! اس سال ماہ فروری میں آپ کی صد سالہ برسی ملک بھر میں بڑی دھوم سے منائی جا رہی ہے۔ آپ کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، ڈاک کے محکمے والے یادگار ٹکٹ نکالنے والے ہیں۔"

" ڈاک کے ٹکٹ "

" جی ہاں، پھر آپ کے نام سے ہال اور عمارتیں بننے والے ہیں۔"

" اجی مجھے اس سے کیا سروکار نہ یہ ٹکٹ مجھے ملیں گے۔ نہ یہ عمارتیں مجھے رہنے کو ملیں گی"

" تو حضرت! مجھے بتائیے کہ آپ کو کس چیز کی خواہش ہے!"

" میں تو بھئی بس اب دعاؤں کا محتاج ہوں، میرے چاہنے والے میری برسی کے دن قل درود پڑھ کر بخشیں تو مجھے سب کچھ مل جائے گا، بھر پاؤں گا"

یکایک میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے بستر پہ دراز ہوں بتی جل رہی ہے اور میرے ہاتھ میں دیوانِ غالب کا مصور نسخہ ہے۔ تو جو کچھ دیکھا عالم خواب تھا یا عالم خیال۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب

رضیہ بیگم
بی اے (سال اول)

غالبؔ جنّت میں

غالب کی ضعیفی نے انہیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ کانوں کو سنائی نہیں دیتا۔ غذا بہت ہی کم ہوگئی ہے غنودگی کے عالم میں اپنے شعر کو دہرا رہے ہیں۔

"ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے"

دروازہ زور سے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ غالب نوکر سے اشارے میں پوچھتے ہیں کہ کون آئے ہیں نوکر کہتا ہے۔ مولانا حالؔی۔ شیفتہ، احسن اللہ خان اور نواب ضیاء الدین احمد خاں آئے ہوئے ہیں۔ سب کو بٹھایا جاتا ہے غالب کے طبیعت کے بارے میں نوکر سے پوچھا جاتا ہے نوکر بتاتا ہے کہ بہت خراب ہے، کچھ دیر کے بعد غالب بیہوش ہوجاتے ہیں۔ سب متفکر ہیں کہ کیا کریں۔

عالم ارواح میں غالب کی ملاقات جنت کے داروغہ رضوان سے ہوتی ہے۔

رضوان ۔ آداب ! کیا ہے ؟ ادھر کیوں گھوم رہے ہو کیا ارادہ ہے ؟

غالب ۔ خوب یہ آپ کا تجاہل عارفانہ ہے۔ آپ کے پاس کس نے بھیجا گیا ہوں کہ آپ مجھے جنت کی سیر کرائیں اور وہاں کے حالات سے واقف کرائیں۔

رضوان :۔ مگر تم تو دنیا میں جنّت کو دوزخ میں جھونک دینے پر آمادہ تھے۔

غالب :۔ ہائے ہائے ! جو رونا دنیا میں تھا وہی یہاں بھی۔ واہ ری قسمت واہ۔

رضوان ۔ [غصہ میں آجاتا ہے اور کہتا ہے] کیا مطلب۔

غالب :۔ جب تک دنیا میں رہا لوگوں نے میرے کلام کی قدر نہ کی اور برا بھلا کہا نہ لوگوں نے مجھے سمجھا۔ اس طرح دنیا میں تو رنج و غم سہتا رہا مگر یہاں پر بھی وہی بات۔

رضوان :۔ [رضوان جنت میں ر ہنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے] خیر نہیں جنت میں تو لئے چلتا ہوں مگر جس نگر میں آپ جا رہے ہیں وہ کبھی نام کو بھی نہیں لے گا۔ اس لئے جمع خاطر رہیے ۔

غالب :۔ آپ کی تقریر تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ پتہ نہیں آپ کو کسی طرح غلط فہمی ہو گئی ہے

رضوان :۔ کیا یہ شعر تمہارا نہیں ہے ؟

غالب :۔ کونسا شعر ؟

رضوان :۔ یہی کہ

" وہ چیز جس کے لئے ہم کو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے "

غالب :۔ جی شعر تو میرا ہی ہے لیکن میں آپ سے بادۂ گلفام کی درخواست کی ہوتی تب ٹھیک تھا۔ قبل ازمرگ واویلا کے کیا معنی ؟

رضوان :۔ اچھا چلو۔ مگر ایک بات کا وعدہ کرو کہ وہاں کسی قسم کی رائے نہ دو گے ۔

غالب :۔ آپ کو یہ شبہ کیسے ہوا ؟

رضوان :۔ تمہارے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

" کوئی دنیا میں باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب وہوا اور سہی "

کہ تم اس باغوں کو ارضی باغوں کی طرح سمجھتے ہو۔

غالب :۔ میں اس سیر سے تو بہ کرتا ہوں۔ آپ تو نکاح کی شرطیں قبولوا رہے ہیں ۔ اچھا یہ تو کار جو ۔ پروانۂ جنت ہے ان پابندیوں کے ساتھ داخل ہونے سے درگزر۔ اور یہ کہہ کر جانے کے لئے مڑتے ہیں ۔

رضوان :۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو ! بات صرف یہ ہے کہ تم مخدوش ہو ! اس لئے مجھے اتنی حفاظتی تدابیر کرنا پڑے ۔ ہیں تو ہر فرد کو بغیر پرسش کے ہی جنت میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہوں ۔ میرا بس چلتا تو میں تم کو ہرگز جنت میں داخل ہونے نہ دیتا ۔ مگر کیا کروں حق تعالیٰ کا حکم جو ٹھہرا۔ اسلئے حکم الٰہی کی سرتابی کی مجال نہیں ۔ اچھا چلو ۔

[غالب اور رضوان دونوں جنت میں داخل ہوتے ہیں]

غالب ہر چیز کا یکے بعد دیگرے غور سے جائزہ لیتے ہیں۔ اتنے میں دور سے انہیں کچھ چمکتے ہوئے تند و تیز شعلے نظر آتے ہیں ۔ بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو جنت زیادہ پسند نہیں ۔

غالب :۔ یہ تیز روشنی کیسی ہے ؟

رضوان :۔ یہ تو دوزخ کی آگ ہے ۔ جو گنہگاروں کو جلایا جاتا ہے ۔

غالب :۔ [بغیر سوچے سمجھے عرش کی طرف سر اٹھا کر خدا سے دعا مانگتے ہیں]

یا الٰہی! تو نے مجھ جیسے گنہگار کو جنت عطا کی، اور یہ بہت بڑا احسان کیا جس کا میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ مگر میری ایک آرزو ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔

ندائے غیبی :۔ اور کیا چاہتا ہے ؟

غالب :۔ کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ڈالیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی۔

ندائے غیبی :۔ او ناداں تیری بات بہت نرالی ہے۔ تیری یہ آرزو کیوں پوری ہونے سے رک جائے جا اور اپنی احمقانہ خواہش کا مزہ چکھ۔

دوزخ کے شعلے آہستہ آہستہ نزدیک آنے لگتے ہیں۔ پہلے تو غالب اس بڑھتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور جب شعلے بالکل قریب آجاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ شعلے اور قریب آجاتے ہیں اور غالب گھبرا کر سجدے میں گر جاتے ہیں اور گڑگڑا کر خدا سے اپنی احمقانہ خواہش کی تلافی چاہتے ہیں کہ اے پروردگار! میں نے اس احمقانہ خواہش کا مزہ چکھ لیا ہے۔ اب مجھ میں ان شعلوں کی تپش کو سہنے کی تاب نہیں ہے۔ مجھے اس غلطی سے معاف رکھ اور غالب گرمی کی وجہ سے بیہوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہ شعلے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔ پسینے میں شرابور ہو گئے ہو گئے ہیں۔ حکیم صاحب نبض دیکھتے ہیں۔ ٹھیک چل رہی ہے۔ ہوش میں لایا جاتا ہے۔ آنکھیں کھول دیتے ہیں سب کو اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہتے ہیں۔ پھر اپنا شعر زیرِ لب دہرا رہے ہیں۔

"ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

سب کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ ہے۔

جو لوگ اس جہاں سے اُٹھ چکے ہیں ان میں کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش میں ان کی زندگی میں ان سے مل سکتا۔ ان میں ایک غالب بھی ہیں۔ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔

غالب ، اردو اور تاج محل

یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں۔

(رشید احمد صدیقی

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت
ریڈر و صدر شعبۂ اردو ۔ گورنمنٹ کالج ۔ بنگلور
(سابق پرنسپل مہارانی کالج میسور)

غالب کی انفرادیت

(ان کی شخصیت اور شاعری میں)

مرزا غالب کی شخصیت بڑی پہلو دار شخصیت تھی اور ان کی اس پہلو دار شخصیت میں سب سے نمایاں خصوصیت ان کی انفرادیت تھی ۔ چاہے ان کا رہن سہن ہو کہ ان کی وضع و قطع ۔ چاہے ان کی پوشاک ہو کہ ان کا خورد و نوش ۔ چاہے ان کی شاعری ہو کہ ان کی مکتوب نگاری ۔ طبیعت کی اپج اور انفرادیت جھلکی پڑتی ہے ۔ غالب کو روش عام پر چلنا اور دوسروں کے پامال راستوں کو اختیار کرنا طبعاً سخت ناپسند تھا ۔ غالب کے زمانے میں دہلی کے عام لوگوں کی وضع و قطع یہ تھی کہ منھ پہ داڑھی اور سر پہ بال رکھتے تھے ۔ غالب جوانی میں داڑھی منڈھاتے تھے اور سر پہ بال رکھتے تھے ۔ لیکن جب ادھیڑ عمر کو پہنچے تو داڑھی رکھ لی ، وضع عام سے بچنے کے لئے سر منڈھا دیا ۔ یہی حال ان کے لباس کا ہے ۔ غالب کے دور کے شعراء اور شرفا کی تصویریں تو آپ نے دیکھی ہی ہوں گی ، لیکن ان کی مخصوص کلاہ پا پاخ او سیاہ پوستیں کی چوگوشہ لمبی ٹوپی اور ان کا جغہ یا لمبی قبا سب سے الگ پہچانے جاتی ہے ۔ کھانے پینے کے معاملہ میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہی نظر آتی ہے ۔ گرمی ہو یا سردی ہمیشہ نہار منہ بادام اور مصری کی ٹھنڈائی کا پینا ، چنے کی دال کا بہت پسند کرنا ۔ اور ہر سالن میں اس کا ڈالنا ۔ رواج عام کے برخلاف پان کا نہ کھانا ، شراب پینا لیکن عام شرابیوں کی طرح اس کی تلخی گوارا نہ کرنا ۔ تند و تلخ دیسی شراب کی جگہ عمدہ فرانسیسی شرابوں کا انتخاب کرنا اور اس میں بھی قند اور عرق گلاب ملا کر پینا یہ سب باتیں ان کی طبیعت کی انفرادیت ہی کی نشان دہی کرتی ہیں ۔

غالب کی انفرادیت کا ایک بہت بڑا مظہر ان کی مکتوب نگاری کا وہ انداز ہے جو خاص ان ہی کی ایجاد ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ انہیں مرے سو سال ہونے آئے ہیں ۔ اس دوران میں بہتوں نے اردو میں اچھے اچھے خط لکھے لیکن

بلامبالغہ اب تک ان کے جیسا دلچسپ مکتوب نگار اردو کو نصیب نہ ہوا۔ غالب نے اردو میں کسی مستقل موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ انہوں نے اردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے بے شمار خطوط ہیں اور چند تقریظیں، خطوط مستقل تصنیف کے ذیل میں نہیں آتے اس کے باوجود ان کی تحریر کا کیا اعجاز ہے کہ ان خطوط ہی کی بنیاد پر وہ اردو زبان کے بہت بلند پایہ نثر نگار تسلیم کرلئے گئے۔ اگر وہ اردو زبان کے مایۂ ناز شاعر نہ بھی ہوتے تو صرف ان خطوط ہی کی بنا پر اردو ادب میں مستقل اور بہت اونچی جگہ پاتے۔

غالب کے دور تک بھی فارسی رعب ذہنوں پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ فارسی کی بجائے اردو نثر میں کچھ لکھنا کم علمی اور کم سوادی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز ہونے کے باوجود اپنے دور کی چاہے اردو ہو کہ فارسی کی رسمی اور مراسلے، مکتوب نگاری سے سخت نفرت تھی۔ وہی رواج عام سے بے زاری، وہی روشِ عام پر چلنے سے اجتناب۔ غالب نے اردو میں خط و کتابت شروع کی تو ان کی جدت پسند اپج طبیعت نے یہاں بھی اپنے لئے سب سے الگ راہ نکالی۔ خط کیا لکھا سکا تھا کو مکالمہ بنا دیا، ہزاروں کوس دوری کے باوجود آپس میں مل بیٹھ کر باتیں کرنے کا لطف پیدا کر دیا۔ لمبے لمبے رسمی القاب کو قلم زد کر کے ان کی جگہ بے تکلف سیدھے سادھے القاب، آداب مزاج پرسی، خیریت نگاری کے بندھے بے جان الفاظ کی جگہ جاندار اور پھڑکتے ہوئے فقرے اور رواں دواں عبارت آرائی نے ان کے مکاتیب کو ادب پارے بنا دیا۔ غالب نے جیسی پیاری اور بانکی نثر لکھی ان سے پہلے ویسی بانکی اور سیدھی سادی نثر اردو میں ڈھونڈنے سے کہیں نظر نہیں آتی۔ وہی اس نثر کے موجد اور وہی اس کے خاتم ہیں۔

فارسی کے اثر کے تحت جیسی پر تکلف اور پر تصنع اردو نثر لکھنے کا رواج غالب کے دور میں چل رہا تھا۔ اس کا جادو غالب کے قلم نے خصائص کیمیا بن کر توڑ دیا۔ سرسید کی دور بیں نگاہوں نے اس طرح کی نثر نگاری کی افادیت کو سب سے پہلے تاڑا۔ ان کی کتاب آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن کے چھپنے کی نوبت آئی تو انہوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کی مروج و مقبول پر تکلف طرز میں لکھے ہوئے آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن کی زبان بالکل ہی بدل دی۔ اور غالب کی صاف، سیدھی سادی اور فطری نثر نگاری کی پیروی کو اپنا مستقل شعار بنا لیا۔ فطری انداز، سادگی، بے تکلفی، شوخی، پاکیزہ ظرافت اور روانی غالب کی نثر کی اہم خصوصیات ہیں۔ نثر نگاری کا یہ منفرد انداز اردو ادب کو غالب کا بہت بڑا عطیہ اور بڑی گراں قدر دین ہے۔

غالب کی شاعری بھی ان کی انفرادیت پسندی کا ایک اور بہت بڑا مظہر ہے۔ ان کی انفرادیت کی داد دینے کے لئے ان کے دور کی اردو شاعری پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ہوگا۔ ولی اورنگ آبادی پر اردو ادب کا قدیم یا دکھنی دور ختم ہو جاتا ہے اور ان ہی سے اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ولی کے بعد شمالی ہند کے تمام شاعروں نے ولی کے بنائے ہوئے راستے ہی کو اپنے لئے نشانِ منزل قرار دیا۔ خود ولی نے اپنے سامنے فارسی غزل کو رکھا۔ ہندی اور فارسی شاعری کے موضوعات کو اس میں گھلا ملا کر دلکش شاعری کے سوا ولی نے فارسی کی خوبصو

ترکیبوں اور ہندی اور فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے ایک ایسی زبان کی طرح ڈالی جس میں دونوں زبانوں کی مٹھاس اور خوبیاں ہونے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن ولی کے بعد سے اردو کے شاعروں کے طرزِ تخیل اور ان کے طرزِ بیان دونوں میں فارسی کا اثر غالب ہوتا گیا اور آگے چل کر اردو شاعری بڑی حد تک فارسی شاعری کی نقالی بن کر رہ گئی۔ غالب کا دور آنے تک میر اور سودا، میر حسن، خواجہ میر درد، مومن اور ایسے ہی گنے چنے دو چار شاعروں کو چھوڑ کر کہ ان کے پاس خود اپنا فکری سرمایہ بھی تھا، باقی ان گنت شعراء اسی نقالی میں مبتلا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک مضمون کے سو سو طرح بندھ جانے کے بعد زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی، قافیہ پیمائی، تنگ بندی اور دور از فہم تشبیہوں اور مشکل سے مشکل زمینوں میں ہرزہ سرائی کا میدان ہی اب اردو شاعروں کے سامنے رہ گیا تھا

غالب نے آنکھ کھولی تو اردو شاعری کی دنیا پر ایسی بدمذاقی کو مسلط پایا۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر شاہ نصیر مانے جاتے تھے۔ شاہ صاحب تو بہرحال شاعری نہیں کرتے تھے، ہاں الفاظ کا گورکھ دھندوں کا تماشا اور مشکل زمینوں میں دشوار قافیوں کی نٹ بازی کے کرتب ضرور دکھا رہے تھے۔ یہی رنگ اس وقت کی اردو شاعری پر چھایا ہوا تھا۔ غالب کی انفرادیت اور طبیعت کو اپنے زمانے کی شاعری کی یہ نٹ بازی اور ذہنی جمناسٹک بالکل نہ بھائی۔ انہیں بھونڈی نقالی اور دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کا نگلنا کسی طرح بھی گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے پامال راستے کو چھوڑ کر شاعری میں سب سے الگ نیا راستہ ڈھونڈ نکالا اور اچھوتے اور نادر مضامین کے ساتھ تخیل کی انتہائی بلندی دکھائی۔ انہوں نے اردو کو نئی نئی اور پاکیزہ تشبیہیں بخشیں اور اس زبان کو بڑی جامع ترکیبوں سے سنوارا۔ انہوں نے بڑے بڑے مضامین کو ان ترکیبوں کی مدد سے بہت مختصر لیکن بڑے گٹھے ہوئے انداز میں بیان کیا۔ ان کے کلام کی معنویت اور بلندی عام سطح سے بہت اونچی ہے۔ غالب نے جیسی اور جتنی سادہ پرکار غزلیں لکھی ہیں ویسی غزلیں اردو کے کسی اور شاعر کے پاس کم ہی نظر آتی ہیں۔ ان کے کلام میں بڑی دلکش شوخی ملتی ہے یہ شوخی بھی بالکل منفرد ہے۔ غالب ہی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے بڑے بڑے مضامین کے بیان کے لئے غزل کی تنگ دامانی کو محسوس کیا اور کہہ اٹھے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب نے نہ صرف غزل کی تنگ دامانی کو محسوس کیا بلکہ غزل کو اس کی تنگنائے سے نکال کر اسے بیان کی نئی نئی وسعتیں بھی بخشیں اور لطفِ موت و حیات، جبر و اختیار، سوز و ساز اور عذاب و ثواب کے فلسفیانہ مسائل کے وسیع میدانوں کی سیر کرائی۔ ان کے کلام میں ایک شاعر کی رنگینی، ایک فلسفی کی باریک بینی، ایک رند مشرب کی سرمستی، ایک دردمند اور احساس دل کا سوز و گداز غرض سب ہی باتیں عجیب دلفریب انداز میں گھل مل گئی ہیں۔ حسن و عشق کے چھوٹے مسائل ان کی شاعری میں زندگی کا راز بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی دلی واردات اور اپنے احساسات

کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اپنی فلسفیانہ طرزِ فکر کے لئے غالب نے بڑا اونچا لہجہ اور سنجیدہ اور سلجھا ہوا آہنگ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے اردو زبان اور اردو ادب دونوں کی سطح بہت اونچی ہو گئی۔ خیالات یا مجرد تصورات کی شاعری عام طور پر سپاٹ ہی نہیں بے لطف ہوتی ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ خیالات کو حسیات اور مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں اس طرح تبدیل کر دیتے ہیں کہ اردو کے کسی شاعر کے یہاں یہ خوبی نظر نہیں آتی۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غالب کے یہاں ہمیں مسلمہ عقائد اور دعوؤں کے خلاف ایک عجیب پر لطف تشکیک ملتی ہے۔ ایسی پر لطف تشکیک اردو کے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ وہ کائنات کی ماہیت، تخلیق کی غرض، جزا سزا اور خیر و شر اور دوسرے مسلمات کے سلسلہ میں ایسے ایسے سوال اٹھاتے ہیں جو قریب قریب ہر سوچنے والے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ اس رنگ میں بھی غالب کی شاعری بالکل منفرد ہے۔ اور اردو کا کوئی شاعر اس رنگ کو اس خوبی سے نباہ سکا ہے۔

ہیں آخر کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مختصر یہ کہ غالب کی شخصیت میں دلکش تنوع اور رنگا رنگی حاصل ہے۔ اور اس تنوع اور رنگا رنگی میں ان کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کی ذات میں ایک دل آویز انفرادیت ہے۔ ان کی نظم نگاری میں ایک بدیع انفرادیت ہے۔ ان کی نثر نگاری میں ایک اچھوتی اور نادر انفرادیت ہے۔ اور ہر جگہ ان کی یہی انفرادیت ان کے کمال اور ان کی عظمت کا سب سے بڑی دلیل اور شاہد عادل ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بنگلور)

علامہ اقبال

غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دِلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

پروفیسر محمد ہاشم علی
شعبہ اردو ۔ فارسی
جےپور یونیورسٹی

غالب کی معجز بیانی

غالب نے ایک جگہ یہ دعویٰ کیا ہے

اگر خواہی کہ بینی چشمۂ حیوان بہ تاریکی
سوادِ نظم و نثرِ غالب معجز بیاں بینی

پتہ نہیں یہاں نظم و نثر سے مراد اردو نظم و نثر ہے یا فارسی۔ قیاس اغلب یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ فارسی نظم و نثر سے متعلق ہے۔ کیونکہ غالب کو اپنی فارسی نثر اور فارسی قصیدوں پر بے حد ناز تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "و کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے مدح کے بہت کم۔ نثر میں بھی یہی حال ہے" فارسی قصیدوں کے علاوہ فارسی شعر گوئی کو بھی وہ باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنے دیوان فارسی کو "ریز سخن" کی اپنی دی کتاب کہا ہے۔ ایک قطعہ میں وہ ذوق کو اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

اس قطعہ سے یہ بات بڑی حد تک یقین کی حد تک پہنچ جاتی ہے کہ انکا یہ دعویٰ فارسی نظم و نثر سے متعلق ہے لیکن میں انکے اس دعویٰ کو اردو نظم و نثر کے بارے میں درست سمجھتا ہوں۔ اس لئے جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں۔ غالب نے نظم و نثر دونوں کو دلیری بھی دی اور دلبری بھی۔ خصوصاً اردو نثر کو۔ انہوں نے ایک معنی میں نئی زندگی دی اس میں متانت کے ساتھ ساتھ سلاست و سادگی پیدا کی۔ اردو میں

سنجیدگی، متانت اور معیاری طنز و ظرافت کی داغ بیل بھی انہوں نے ڈالی۔ ان کے خط مکالمہ اور جزئیات نگاری کے بارے میں آنے والے ناول نگاروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ان کے بعض بعض خطوں پر شخصی مقالات کا دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ یہ خطوط شخصی مقالوں کا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی غالب آنے والے مقالہ نگاروں کے پیشرو ثابت ہوئے۔ اسی لئے وہ اردو میں جدید نثر کے بانی اور مکتوب نویسی کے راہ نما سمجھے جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے صحیح فرمایا ہے "اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشیل اور ریلیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں بیاگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دایرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اپنا نظیر نہیں رکھتی"۔

اردو نثر کی طرح "سوادِ طلسم" میں بھی "غالب معجز بیان" کی "کرشمہ سازیاں" اور کارنامے نمایاں ہیں اردو شاعری کو انہوں نے نیا رنگ و آہنگ دیا۔ اردو غزل کی تقدیر انہوں نے ہی متعین کی۔ خود ان کے دور میں شاہ نصیر، ذوق اور ظفر، سنگلاخ زمینوں، محاورہ بندی اور قافیہ پیمائی کے چکر میں مبتلا تھے۔ مومن "فکرِ شاعرانہ" میں الجھے ہوئے تھے۔ آتش "بندش الفاظ" اور "مرصع سازی" میں گم تھے اور ناسخ کے یہاں نئی زمینوں اور نئی بنیوں پر زورِ "ریختہ کی نئی دیوار" اٹھا کرتی تھی۔ صرف غالب ہی وہ شاعر تھے جو قافیہ پیمائی و معنی آفرینی میں امتیاز کرتے تھے۔ اور اس پر شدت سے قائم بھی تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

غالب کی اکثر غزلوں کے بیشتر اشعار واقعی "گنجینۂ معنی کے طلسم" سے پر ہیں۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا تھا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالے ہیں۔ اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے اسی لئے مولانا حالی لکھتے ہیں "جب میر و سودا اور ان کے متقدمین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔

مرزا کے دیوان کی اس "بالکل نئی اور نرالی کیفیت" اور اس "ایک اور ہی سماں" نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اس درجہ متاثر کیا کہ انہوں نے یہ اعلان ہی کر دیا کہ "ہندوستان میں دو الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب"

"دیوانِ غالب" ہندوستان کی الہامی کتاب ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ

ہمارے پچھلے دور کا آخری اور جدید دور کا آغاز ہے۔ اسی لئے ہم دیوانِ غالب کو ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں نئی نسل کی انجیل قرار دے سکتے ہیں۔ غالب ہی بلاشبہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں ہمیں جدید ذہن کا بڑا کامیاب نمونہ ملتا ہے۔ جدید ذہن کی خصوصیات، اس کی ندرت، اس کی پیچیدگی، ذہنی اور جذباتی کشاکش کے باوجود توازن، وحدت اور ترتیب قائم کرنے کی طرف میلان کا پایا جانا ہیں اور یہ تمام خصوصیات دیوانِ غالب میں جگہ جگہ ملتے ہیں اور ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا بالکل بجا ہے "ہر نوجوان نے اس دیوان کے اوراق زندگی کے مختلف موڑ پر کبھی افسردگی، کبھی اشتیاق اور کبھی حسرت کے ساتھ ضرور الٹے ہوں گے۔ غالب نے ہم میں سے اکثر کی زندگی کی رفاقت کی ہے وہ کبھی بے تکلف رفیق کی طرح ہماری حسرتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ کبھی ایک روشن دماغ ہمدرد کی طرح شادابی اور شگفتگی لے کر ہماری صحبتوں میں آتے ہیں اور کبھی ہمارے آہوں اور آنسوؤں میں غم خواری کرتے رہے ہیں" اور خصوصاً آج جب کہ عقیدے کی کمی اور ذہن کی پراگندگی کا دور دورہ ہے۔ بنیادوں کے ہلنے اور ضابطوں کے الٹنے کی وجہ سے سراسیمگی اور پریشانی عام ہو گئی ہے۔ غالب جو "برق سے شمع ماتم خانہ روشن کر سکتے ہیں اور خدا سے آنکھیں چار کر کے انسانیت کا رجز سنا سکتے ہیں" ہم سے بہت زیادہ قریب ہو گئے ہیں اور ان کی یہ قربت ہمیں ایک معنی خیز تجربہ اور ایک مخصوص بصیرت" عطا کرتی ہے۔ اور یہ وہ بصیرت ہے جو علم کی حدوں سے گذر کر اس تلاطم سے پیدا ہوتی ہے جو دریا کی تہوں سے ابھرتا ہے اور اس کی سطح پر اپنے بھنور ڈال دیتا ہے کہ ان کے پیچ و خم میں ساری دنیا گم ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں "غالب زندہ ہوتے تو میں ان سے دوستی کرتا" اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتے ہیں "میں کہتا ہوں غالب مرے ہی کب تھے وہ آج بھی زندہ ہیں اور میری ان سے دوستی بھی ہے۔ جب جی چاہتا ہے ان کے خطوط اٹھا کر پڑھ لیتا ہوں اور ہجر میں وصال کے مزے اٹھا لیتا ہوں۔

غالب نے ایک جگہ پہ کہا ہے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشک فارسی ؎
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

"گفتۂ غالب" خواہ نظم میں ہو یا نثر میں واقعی "بات" ہے۔ اور

بات ہر بات کو نہیں کہتے ؎
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

اور غالب کا یہ دعویٰ بالکل حق بجانب ہے

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور تاریکی میں کوئی چشمہ حیواں" دیکھنے کا خواہاں ہو تو یقیناً اس سے یہ کہا جا سکتا ہے۔

؎ "سوادِ نظم و نثرِ غالب معجز بیاں بینی"

پروفیسر سید اقبال قادری
شعبہ صحافت۔ میسور یونیورسٹی

احوالِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شمار ملک کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ ہماری زبان کے خوش نصیب ترین شعرا میں سے ایک ہیں کہ ان کی شہرت اور قبولِ عام اب تک ایسی ایسی صورتیں اور مدارج اختیار کر چکے ہیں کہ ان کے بعد سوچنا پڑتا ہے کہ ان میں توسیع اور اضافہ کے مزید امکانات کیا ہو سکتے ہیں۔

مرزا غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق اتنی کتابیں، رسالے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اردو اور فارسی کے شاعروں میں سے شاید ہی کسی کے ساتھ اتنا اعتنا کیا گیا ہو، علامہ اقبال کو غالباً مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

غالب کا کلام اور ان کی نثری تصانیف ہمارا بہت بڑا ادبی ورثہ ہیں۔ غالب ایک طرح سے ایک مشترکہ تہذیب و ثقافت کا نمونہ ہیں۔ ان کا مسلک رنگ و نسل، مذہب و ملت اور ذات پات کی قید سے بالاتر ہو کر ساری انسانیت کو ایک رشتۂ یگانگت میں پرونا تھا۔ غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہے۔ اس میں ہر جگہ آفاقی پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو غالب کی شاعری میں ایسے مقامات آ جاتے ہیں۔ جہاں یہ آفاقیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ شاعری میں آفاقیت کے اس عروج نے ہی غالب کو عظیم بنایا ہے۔ اسی کی بدولت غالب کے اشعار بے پناہ تاثیر کے حامل بن جاتے ہیں اور دلوں میں اتر کر روح پر ایک سرخوشی طاری کر دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان اشعار میں پنہاں ہی جذبہ اور احساس کی گونج پاتا ہے اور اپنے ہی افکار و خیال کے خدوخال اس آئینہ میں دیکھتا ہے۔

مرزا صاحب۔ دہلی کے آخری عہد کی علمی بلندیوں اور تہذیبی عظمتوں کی نمائندہ شخصیت تھے۔ شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال نے جن ادبی روایات میں تربیت پائی وہ غالب کے زمانے کی پروردہ تھیں۔ غالب کی قدر و قیمت اس لیے بھی ہے کہ وہ اُن تہذیبی و فکری قدروں کے شناسا اور معیار شناس تھے جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خصوصی ہے۔

غالب ایک برجستہ اسلوب اور فکر آفریں ذہانت کے مالک تھے۔ جس کی ندرت اور دلآویزی، تجربہ و تخیل کے نئے میدانوں اور وادیوں کے انکشاف کے ساتھ ساتھ سرور و نشاط بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب کی آواز، ہر لب و لہجہ

میں ایک عجیب رعب اور طنطنہ پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری کے لہجے میں مدتوں سے بعض سماجی اثرات کے تحت جو نسوانیت سی پیدا ہوگئی تھی اس کو غالب نے بہت بڑی حد تک دور کیا اور اس کو ایک توانا لہجہ بخشا۔ غالب کے ہاں اظہار کے پیرائے پُر جلال ہیں جن میں نشاط کے ولولے بھی ہیں اور مردانہ ہنگامہ خیزیاں بھی۔ ان کے جوشِ بیان میں ایک گرمی ہے۔ سچے جذبات ہیں اور عمرانی تقاضے کارفرما ہیں۔

صحیح معنوں میں غالب ایک محسنِ اعظم ہیں جنہوں نے اردو شعر و ادب کو وسیع ممکناتِ ارتقاء کی راہ پر لگایا۔ اردو اشعار کے لئے وہ قالب مہیا کئے جس میں ہر قسم کے مضامین بے تکلف آراستہ کئے جا سکتے تھے۔ غالب کے اشعار کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے نزدیک زندگی کی تڑپ اور زندگی کی آگ ہی وہ متاعِ گراں مایہ ہے جو لذتِ درد اور لذتِ ادراک کی بیک وقت امین اور سرمایہ دار کہلائی جا سکتی ہے۔

غالب کے خیال میں عقل سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ عقل نفس کی اصلاح کرتی ہے عقل سے سپیرتوں میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ عقل جذبے کی طرح ایک شئے ہے۔ غالب کے یہاں سخن یعنی ادبی تخلیق عقل سے الگ ایک سلسلۂ عمل ہے جس کو وہ عقل سے بلند تر سہی اس کے برابر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ غالب کا عقیدہ ہے کہ سخن کی صحیح قدر و قیمت بھی فکری عنصر کے طفیل ہوتی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ سخن خود بھی ایک متاعِ گراں بہا ہے جو ہمیں اپنے دل و جگر کی طرح عزیز ہے۔

غالب کی شاعری میں ایک فکری لہر ہے۔ ان کی سوچ جذباتی انداز کی ہے۔ غالب کے کلام میں علمی حقائق بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی شاعرانہ فطرت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ غالب اپنی عملی زندگی میں داخلی قسم کے انسان نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ذات اور سماجی تعلیمات کو اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رکھا۔ احباب سے ان کے تعلقات جس نوعیت کے تھے تا آخر دم تک قائم رہے۔ ایک خاص وضع داری کو جو موروثی عوامل اور خاندانی حالات کا ترکہ تھی [illegible] نباہا۔ غالب کے خطوط جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی۔ یہ ان کی مصروف علمی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

بقولِ آل احمد سرور مرزا غالب شاعروں کے رومانوی قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو تخیل کو ایک مذہب کی طرح مانتے ہیں۔ ہر رومانوی شاعر کی طرح غالب تخیل پر پابندی کے خلاف تھے۔ ان کے ذہن میں حسن و عشق کا ایک خاص تصور تھا اور اسی تصور کے زیرِ اثر انہوں نے اپنے "مثالی عاشق" اور "مثالی محبوب" کی تخلیق کی۔

غالب کے اشعار اردو میں بھی بہت ہیں مگر انہیں زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور بجا تھا۔ آپ نے فارسی زبان بڑے ذوق و شوق سے سیکھی تھی۔ کلام فارسی زبان کا سمجھیے یا اردو کا، دونوں میں ایک حساس فنکار کی [illegible] غالب کی شاعری میں احوال اور فرد کے اقدام سے متعلق والی کئی کیفیات ملتی ہیں۔

کلام میں تخلص آپ نے کہیں غالب اور کہیں اسد اور کہیں کہیں نوشہ استعمال کیا ہے۔ گرچہ نام

جناب سلیم تمنائی

جدید مخطوطۂ غالب
اور
مہارانی کالج کی طالبہ

بی بی، یہ خاکسار بمقدار غالب کو پڑھا ضرور ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن تصویر کی حد تک۔ مجھے سے میری تصویر بہتر ہے والی بات بھی کہی ہے۔ یار لوگ جوشِ عقیدت میں زمین سے آسمان پر لے جاتے ہیں اور دشمنی میں آسمان سے زمین پر دے پٹکتے ہیں۔ بات وہی سچی اور کھری جو کانوں سے سنی ہو۔ وہی تصویر بہتر جو آنکھوں نے دیکھی ہو۔ اس لئے ہم غالب پر کچھ نہ کہیں گے، لیکن آپ سے بچنا بھی مشکل ہے۔ اب سنو، ذرا غور سے سنو، ہم ایک کتاب "وبائے تحقیق" ڈھونڈ فرما رہے تھے۔

یعنی سرچنگ بھائی جان ؟

" ہاں سرچنگ بی بی۔ بھائی جان بولے، لیکن بی بی، مادری زبان اردو، اور آپ خواہ مخواہ کے انگلش ورڈز یوز کیے جا رہی ہیں۔

I am Correct ?

سو آں فیصدی Correct بھائی جان"

" تو ٹھیک ہے! بھائی جان بولے، اب سنو، کام کی بات " وبائے تحقیق" ملی " تین چار مخطوطوں کا مجموعہ تھا۔

" یہ مخطوطے کسی طوطے کے بھائی بند تو نہیں ؟ مس کالج نے پوچھا

" یہ مخطوطے کباڑیوں، قدیم کتب خانوں کے ان پڑھ مالکوں اور دانشوروں یا ریسرچ اسکالرز کے بھائی بند ہیں جنھیں نسخی جانئے! ہم کیا فرما رہے تھے ؟ ہاں اس مجموعہ میں ایک مخطوطہ بعنوان " کالج کی ایک طالبہ اور چچا غالب " نظر

پڑھا۔ اس میں تحریر تھا کہ یہ جدید مخطوطہ ہے۔ ہم چونکے۔ پھر مخطوطہ کے مالک کو شیشے میں اتار، گھٹیا سی چائے پلا، اچھی کافی پلانے کے وعدہ پر وہ مخطوطہ اس سے اڑا لائے، اور ہزار کینڈل بلب کی روشنی میں ہم نے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

"پتہ نہیں اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا یا نہیں۔ البتہ اتنی خواہش ضرور کی جاتی ہے کہ دل و دماغ میں سچ و جھوٹ کے فتنوں کو نکال پاک و شفاف دل کے پڑھیں" ہم نے ہر فتنے سے پاک ہوکر پڑھنا شروع کیا۔

"خوب کہی بھائی جان! کوئی دل سے پڑھتا ہے، زبان سے پڑھتا ہے

"کسی کا دل پڑھتا ہے اور کسی کی زبان۔ بھائی جان بولے۔ مگر بھئی بیچ میں بولنا منع ہے۔ اب سنتی جاؤ۔ اگر ضرورت پڑے تو آخر میں فہرست اغلاط منسلک کردیں گے،" ہاں تو لکھا تھا"

"میں مہارانی کالج کی طالبہ ہوں۔ پنے ماحول کی پروردہ ہوں۔ عورت ذات ہوں اور اس کی ہٹ مشہور رہے کئی بزرگوں، دل جلوں اور کند ذہنوں کی نیک رایوں کی کہ عورت کو اعلیٰ تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔ پرواہ کئے بغیر ماں کو سنایا ماں نے باپ کو چٹکی بجاتے منا لیا۔ ابا نیک آدمی تھے اور امی سے ذرا زیادہ ہی دبتے اور ڈرتے تھے۔ غرض کالج میں داخلہ لے لیا زمانہ ترقی پر تھا۔ بڑی ڈاڑھی سے خشخشی داڑھی پر آگیا تھا۔ پھر مونچھوں والوں کا بھی آگیا جو ہمیشہ بڑھانے سے زیادہ مونچھوں پر تاؤ دینا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔

ایک دن استاد محترم نے فرمایا، اس سے پہلے کہ کیا فرمایا، یہ سن لی جے کہ اسوقت استاذ قوم مولوی یا منشی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کی زبان لفظ لکچرار کے ادا کرنے سے قاصر تھی اور قاصر نہ ہوتی تو یہ لفظ لکچرار سے لچر بن جاتا تھا۔ ہاں تو میں عرض کر رہی تھی کہ استاد محترم نے فرمایا کہ ملک فلاں آباد سے ایک دراز ریش بزرگ محترم تشریف لاتے ہیں۔ موکل دنوں کے قبضے میں ہیں اور شیطان ان کی مٹھی میں، روحوں سے انہیں خاص انس اور یاری ہے۔ بابا بات کی اور روانہ کردیا۔ اگر تم چاہو تو ان کے پاس لے چلوں اور عرض کروں کہ آئندہ سبق غالب سے متعلق ہے۔ مصنف کا اعتبار نہیں! جھوٹ سچ بک جاتے ہیں۔ انہیں سے کچھ باتیں حل کرلیں، محنت ہو جائے گی اور الٹے کچھ غزلیں ترنم سے سن لیں۔

قصہ مختصر، ایک اتوار ہم لوگ ان پیر و مرشد کے پاس گئے۔ تسلیمات کے بعد بیٹھ گئے اور مدعا عرض کیا۔ درخواست قبول ہوئی، فرمایا ابھی ایک شیطان کو حاضر کرچکا ہوں۔ انشاءاللہ غالب خستہ حال کی روح کو حاضر کروں گا۔ بہتر ہوتا کم سے کم کچھ آم ضرور لاتے۔ شراب کے بدلے شربت چلے گا۔ اب ان میں پہلی سی جرأت بھی نہیں۔ یہ کہہ کر کچھ پڑھا، کوئی عربی سورہ، کوئی فارسی مثنوی، کچھ پلے نہ پڑا۔ ہم سارے کے سارے دو چار سورتوں کے ہی حافظ تھے، اتنا سنا اور سمجھا کہ بزرگ محترم خاصے ترنم میں بزرگ روح غالب حاضر شد حاضر شد، فرما رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں غالب کو نازل ہوتے دیکھا۔ وہی چہرہ مہرہ جو مصنف یار لوگوں نے پیش کیا ہے۔ بڑے سنجیدہ نظر آئے۔ ہمیں ڈر رہا کہ ادھر ہم نے سوال کیا ادھر فرمایا کہ اللہ نے صورت ہی ایسی بنائی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم نے نقابیں الٹ دیں وہ مسکرائے اور بھرپور مسکرائے۔ اور فرمایا "اللہ با آفتاب و مہتاب طلوع ہوگئے" ہمیں، محترم آپ اور مس کالج اور مس شیطان اور مس شریر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کالج میں اس طرح دیکھے گا

مطلب تھا مرمت کریں۔ اور مرمت ہو جاتی تھی۔ لیکن ہم لاکھ شریر سہی بڑوں کی خطائیں معاف کرنے میں اول اور آگے تھیں۔ مس شیطان نے زیرلب کہا کہ چچا مہتاب و آفتاب نے غزلیں کہلوالیں اور بیسیوں کی امیدوں نے قصیدے لکھے لیکن تاد رنامہ ایک ہی ہوا۔ اس میں کچھ اضافہ ہوتا تو کوئی بات ہوتی۔

ہم نے سنبھل کر سلام کیا۔ پھر کلام کی فکر تھی کہ ہماری ایک سہیلی نے آنکھیں بند کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا، نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب، لیکن دنیا جہاں کے چچا صاحب۔ ہیں مہارانی کالج کی تمام حاضر و ناظر اور غائب طالبات کی طرف سے، اور ہے، یہ خواہش یہ اچھا کروں گی کہ آپ اپنا کلام بلاغت نظام، کوتیا، امور پوئٹری انرتم میں سنا کر ہمیں خوش کریں۔

"بی بی، غالب مسکرائے، تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن تمہارے چچا نے گنگنایا ضرور ہے لیکن تنہائی میں، اور بی بی رونا اور گنگنانا کسے نہیں آتا۔ ہم نے کسی کے سامنے ترنم سے کبھی شعر نہیں پڑھے۔ تحت اللفظ میں سنا دیتے تھے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ہمارے شعر کبھی پلّے بھی پڑے ہیں۔

"ارے چچا میں نے کہا" یہ ہندی اردو دونوں زبانوں اور بھاشاؤں میں آپ کے شعروں کا مطلب سناتی اس کا کمال یہ ہے کہ جو مطلب اردو میں پیش کرتی ہے وہ ہندی میں بھی پیش کرتی۔

مثلاً ؟ غالب نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

مس سہیلی نے فرمایا حضرت چچا اور شریمان چاچا غالب! آپ فارسی اور اردو میں ماہر تھے۔ میں اردو اور ہندی میں اناڑی ہوں۔ ویسے لائق وفائق ودوان ہوں۔ لیکن اپنے منہ میاں مٹھو کون بنے چچا .... اب سنئے، میں اردو میں آپ کا نام غالب پڑھتی ہوں اور ہندی میں گالب، اب رہا معاملہ مطالب کا۔ ملاحظہ ہو۔ یہ شعر آپ ہی کا ہے نہ چچا۔ ؟ ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

مطلب عرض کیا ہے کہ مکّے شریف کوئی شریف ہی جاتا ہے، ہے نہ چچا! سہیلی نے غالب کے چہرۂ مبارک کی طرف انگلی آگے کرتے ہوئے کہا۔ یہ منہ اور مسور کی دال اور مکہ شریف کی زیارت، توبہ توبہ، میری توبہ، شرم: ایسا ہوا نہ ہوتا" لیکن یہ جواب سن۔ یا اس ریمارک پہ آپ کی انا بھڑکے گی۔ اور آپ فرمائیں گے۔ ہم اسی صورت اور شکل میں جائینگے اب میں عرض کروں گی، "آپ ضرور جائیں گے چچا۔ کیوں کہ حیا اور شرم نام کی کوئی چیز آپ کے پاس نہیں۔ آنکھوں کا پانی مرچکا ہے۔

"بی بی، چچا نے ذرا جلدی میں فرمایا۔ "اب ہندی ارتھ بتاؤ۔

"سنئے شریمان چاچا گالب! سہیلی نے کہا "آپ تن آسان ٹھہرے آپ سے محنت نہیں ہوتی۔ سو اچت

ہے آپ کے باپ دادا اور پڑدادا یعنی سب کے سب سپاہی تھے۔ آپ تو صرف شاعر ٹھہرے، جس کا پیشہ شاعری ہو وہ کام دھندے سے گیا سمجھو۔ آپ کو پتہ ہے چاچا کہ حج کرنے میں کافی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ آپ نے صرف حلوے مانڈے سے کام رکھا پاپڑ کہاں بیلے۔ اور چاچا ہندی بھاشا میں شرم کے معنی محنت کے ہیں۔ اس معنی یا ارتھ اور آپ کی طبیعت کے سہارے میں نے اس شعر کا ارتھ یوں سمجھا ہے،

شعر بیان کہ غالب جدھر منہ اٹھا اس طرف جا کر کعبہ نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کافی شرم یعنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ محنت تو آپ سے ہوتی نہیں۔ پھر مکہ میں پرویش (داخلہ) کیسے کرو گے۔ حج کہاں ہوگا۔

"بیٹی ویسے شاعر کا کام شعر کہنا ہوتا ہے مطلب بتانا نہیں، یہ کام آپ لوگوں کا ہے" چچا بولے "کبھی کبھی ہم سوچنے لگتے ہیں کہ ہم نے کیا کہنا چاہا تھا۔ اور بات پتے نہیں پڑتی۔ یہ خدا کی دین ہے۔ اور بی بی اپنے کلام کی کئی شرحیں دیکھیں مگر یہ ارتھ ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔ خدا جانے زمانے کے ساتھ ساتھ کتنے نئے نئے معانی گھڑے، اور ڈھائے جائیں گے۔ مگر بی بی انگریزی اور جنوبی ہند کی دوسری زبانوں میں مطلب نہیں، عرض کر رہی ہیں آپ ؟

"فی الحال نہیں" سہیلی نے فرمایا۔ اور میں نے مس دکنی کی طرف اشارہ کر چچا سے فرمایا۔ "چچا ذرا لگے ہاتھوں مس دکنی سے آپ کے ایک شعر کا مطلب سنئے۔

چچا سنبھل بیٹھے، اصرار فرمایا اور مس دکنی شرمائے بغیر ترنم میں شعر پڑھا۔ ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیانِ غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مس دکنی ذرا کالی تھیں۔ آواز کوئل کی سی تھی۔ چچا جھوم گئے۔ ڈومنی یاد آ گئی ہو مغل بچے کو۔

اب مس دکنی نے فرمایا "چچا ہمارے گھر ایک نانی آیا کرتی تھیں۔ داستان گوئی ان کے رگ رگ میں سمائی تھی، ہم ان کی زبان سے انس و جن و پری کی کہانیاں سنتے۔ بس مزا آ جاتا۔ ہم انہیں بڑی لائق و فائق سمجھتی تھیں۔ ان سے مرعوب تھیں۔ تن و توش بھی بھی ایسا تھا کہ علم کے بغیر بھی دبنا پڑتا تھا کہ زنفرسخا بھی ان کا ہاتھ تھوڑا کہ دو زمین شاہ ظفر کو میسر نہ ہوئی۔ ہمیں نصیب ہو جاتی ہاں تو ایک محترمہ نے فرمایا کہ چچی، میری بیٹی بڑی سیانی ہے اور سنا ہے کوئی غالب ہے۔ نہ جانے موا کون ہے۔ کہا کہ شاعر ہے اس کا شعر و بیہ لئے پھرتی ہے۔ گنگناتی پھرتی ہے۔ استانی نے شرط لگائی ہے کہ جو طالبہ اچھا مطلب بتائے گی اسے انعام دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر مجھ کے سامنے سارا شعر دھر دیا۔ چچی دکنی بولتی تھیں، تو دکنی ہے۔ دکنیچ بول پر سو فیصدی عمل فرماتی تھیں۔ انہوں نے شعر کو الٹا پلٹا۔ ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا۔ پھر بار بار سنا۔ خود پہلے تحت اللفظ میں پڑھا پھر ترنم میں۔ اللہ رے آپ کی مسکراہٹ! اور دکنی میں فرمانے لگیں۔

اگو بوا! اتنا تاج (اتناہی) یہ غالب صاحب ہیں ناجی، او بولیں بوں بولیں۔ ؟

غالب! سب نے کورس میں کہا!

جذبات میں طلاطم پیدا کر دیا اور ذہن شعر کو گل بوٹوں سے لالہ زار بنا دیا۔ رومانیت نے الفاظ کا جامہ پہن کر زبان حال سے اپنے خالق کی طرف اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ غالب نے اس مہذب طبقے کے اجتماعی معیار کا پاس نہیں کیا جو کہ ہمارے شاعروں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کے برعکس اپنے اور صرف اپنے دل پر القا ہونے والے خیالات کی تعمیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف انہیں مضامین کے بیان تک محدود نہیں رکھا جو شعری روایات کے ذخیرے میں مستند اور سکہ بند تصور کئے جا چکے تھے بلکہ اپنے کلام میں نئی تشبیہات، شگفتہ اشارے اور نت نئی ترکیبیں اپنے منفرد انداز میں پیش کیں۔ ان کی روح پیاسی تھی وہ دریا طلب کرتے تھے اور انہیں شبنم کا قطرہ ملتا تھا۔ ان کا حوصلہ بڑا تھا مگر حوصلے کی نسبت سے انہیں نعمت عطا ہوئی تھی۔ اسی شکست کی بازگشت ان کے کلام میں اور خصوصاً مقطعوں میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

صرف رومانیت یا نری پیکریت (IMAGERY) قاری کے ذہن کو اتنا متاثر نہیں کر سکتی جتنا کہ ان دونوں کا امتزاج پیکریت جسے محاکات بھی کہہ سکتے ہیں اس کی تعریف شبلی نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "محاکات کے

لئے کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔

محاکات میں شبلی نے لفظی اور مادی دونوں قسم کی تصویروں کو شامل کر لیا ہے اور محاکات کی تکمیل کے لئے تشبیہات، تمثیلات اور رمز و کنایہ بھی جائز تصور کیا گیا ہے۔ جہاں کسی کی بہادری یا مکاری مقصود ہو وہاں رستم یا لومڑی کا ذکر کر لے آنا انسانی ذہن کو فوراً اس خصوصیت کی طرف مبذول کر دے گا۔ غالب کے کلام میں پیکریت اور رومانیت میں یوں سمو لی گئی ہے کہ باہم شیر و شکر ہوں۔ انہوں نے تخیل کی مدد سے پیکریت کے نقوش ابھارے ہیں۔ فطرت خود اتنی دلنواز ہے کہ اس کے سامنے دوسری دلنوازی مشکل سے جگہ بنا سکتی ہے۔ پیکریت اور رومانیت کا منتہائے کمال یہ ہے کہ شاعر ہمیں اس نقطۂ عروج تک لے جائے جہاں تک اس کے ذہن کی رسائی ہوئی تھی اور ہر قاری بھی اس کیفیت میں مبتلا ہو جائے جو شاعر کے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ اور ہر سخن فہم بے ساختہ کہہ اٹھے کہ واللہ شاعر نے ہمارے منہ سے بات چھین لی۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ایک اور عنصر جس کا غالب کے مقطعوں میں اظہار ہوا ہے تنوطیت ہے جس سے ان کے کلام کو جلا بخشی ہے

اس بحرِ زخار جسے غم کہتے ہیں کی تند و تیز موجیں ہیں جو کبھی سفینے کو ڈبو دیتی ہیں اور کہیں پار لگا دیتی ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے سے اس رجحان کا پتہ ضرور چل جاتا ہے ۔ شعور کو پہنچنے کے بعد سے آخری عمر تک غالب ایسے بے کس اور مظلوم فرد کی شکل میں نظر آتے ہیں جن پر قدرت اپنی ہر ستم ظریفی آزماتی ہے ۔ عالمِ شباب کو پہنچتے پہنچتے خواہی نخواہی ازدواجی زنجیروں میں جکڑ دئے جاتے ہیں۔ زندگی بھر آمدنی کی کمی اور مصارف کی زیادتی خانگی جھگڑوں کا کربناک سلسلہ جو فی کی بخشش ہاں گھر بار جس میں فردا اپنی صلاحیتوں اور عزم و استقلال کے بل ہوتے پر خوش آئند زندگی اور سنہری مستقبل کی دیواریں کھڑی کرتا ہے فکرِ معاش میں گزر جاتی ہیں بلکہ اپنے پیچھے تلخیوں، ناکامیوں اور حسرت و محرومیوں کا لامتناہی سلسلہ چھوڑ جاتی ہیں جن میں محبوبہ کی موت، بھائی کا جنوں، بیگانوں کی بے مہری اور ہم چشموں کی بے مروتی بھی شامل ہے ۔ اس طور سے سوگوار جوانی بیتی بڑھاپا کیا آیا کہ رنج و غم کا سیلاب آگیا ۔ غدر کی مصیبتیں، بھائی کی موت، پنشن کا بند ہونا اور اس پر طرفہ برہان قاطع کے سلسلے میں ادبی مناقشتیں اور انہیں آلام سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خود ندیرِ اجل ہو گئے ۔

قنوطیت کا فلسفہ سب سے پہلے شوپن ہار نے پیش کیا ۔ غالب کے یہاں قنوطیت انفرادیت کی بجائے ہمہ گیری اور آفاقیت اختیار کر لیتی ہے ۔ قنوطیت ہر فن کار کے لئے قوتِ تحریک ہوتی ہے۔ لیکن چند ایک شاعر خود اس غمِ ذخار میں یوں گم ہو جاتے ہیں کہ بجز انفعالیت کے اور کوئی راہ معین نہیں قرار پاتی اور حزن ان کے سراپے میں سرایت کر جاتا ہے ۔ ہر شعر ذاتی غم کی پرچھائیں بن جاتا ہے ۔ غم سے اس حد تک ہم آہنگی فنکار کے شعور کو جکڑ لیتی ہے اور ذاتی صلاحیتوں کا انعکاس محدود ہو جاتا ہے ۔ یہ قنوطیت کی حد ہے کہ شاعر کی اپنی آواز سلب ہو جاتی ہے اور اس کی زبان سے صرف غم بولنے لگتا ہے ۔ انفعالی کیفیت ہر شعر سے مترشح ہونے لگتی ہے ۔ اثباتی رجحانات کی گنجائش مشکل سے نکل سکتی ہے ۔ لیکن غالب کے یہاں یہی اثباتی کیفیت ان کے غمِ ذاتی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ۔ گویا غالب غمِ ذاتی کے ساتھ غمِ دوراں کے فرائض بھی ادا کرنے چلے جاتے ہیں ۔ شاعر کے دل کو ہمہ گیری اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ اس غم کائنات کی وسعتوں پر محیط ہو جائے اور وہ بنی نوعِ انسان کے لئے محزوں ہے نہ کہ اس کی ذات کے لئے احساسِ نارسائی، محرومی اور شومیِ قسمت ایسے عناصر ہیں جن سے غالب کے احساسات کے سوتے پھوٹتے ہیں اور وہ غمِ ذاتی کے ساتھ غمِ دوراں کی بھی ترجمانی کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی مصائب میں گھر کر بھی زندگی کی آرزو ان کے باغ و بہار دل سے یک قلم محو نہ ہوئی ۔ غم کا جذبہ مختلف طبائع پر مختلف انداز سے اثر انداز ہوتا ہے ۔ اثر پذیر قوتیں اس میں جذب ہو جاتی ہیں اور اسی کو تصورِ حیات سمجھ لیتی ہیں ۔ غالب جیسے فن کار کے یہاں یہی جذبہ زندگی کی اعلیٰ وارفع اقدار تک رسائی کے لئے ممد و مددگار ہوتا ہے اور خود کے لئے نہیں بلکہ عام انسانیت کے لئے جمشید کا پیالہ بن جاتا ہے جس میں کبھی غمِ جاناں اور کبھی غمِ دوراں کی لکیریں قسمت کی لکیروں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں ۔ غالب کے اکثر مقطعوں میں انہیں حزنیہ خیالات اور غمگین ارتعاشات کی دبیز چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے بلکہ ہراں کے لب ہائے خندہ ہوں دل محیطِ گریہ ہی دکھائی دے گا ۔ غم میر کے یہاں زندگی بن گیا اور غالب کے یہاں

جشن و زندگی ۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(بقیہ احوالِ غالب ۔ صفحہ ۶۸)

وہ کرشمے دکھائے کہ ان کی نظیر دوسری زبانوں میں مشکل سے ملے گی ۔

غالب نے اردو نثر نگاری کا حد درجہ بدیع اسلوب پیدا کیا اور اس میں حقیقت نگاری کے حیرت انگیز کمالات دکھائے ۔

اس عظیم القدر محسنِ اردو کی یاد شگفتہ رکھنے کے لئے ہم جو کچھ بھی کر سکیں گے وہ ہماری احسان شناسی کا ایک جائز مظاہرہ ہوگا ۔

اسد اللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ ترکستان کے افراسیاب بادشاہ سے جا ملتا ہے۔

مرزا عبد اللہ بیگ خاں آپ کے والد کا نام ہے جن کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہوا۔ غالب کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ مرزا توقان بیگ غالب کے دادا اور خواجہ غلام حسین کمیدان نانا تھے۔

موزونی طبع کے باعث اسد اللہ خاں کی طبیعت بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھی۔ غالب کی نثر نگاری بھی اپنی جواب آپ تھی۔ نثر میں آپ کی سات کتابیں زیادہ مقبول و معروف ہیں۔ آپ کے دیوان فارسی میں تقریباً دس ہزار اشعار پائے جاتے ہیں۔ آپ کا "دیوان ریختہ" یعنی اردو دیوان متقابلتاً فارسی کے نہایت مختصر ہے۔ "مہر نیمروز" نامی کتاب تاریخ سے متعلق ہے۔ اس میں خاندانِ تیموریہ کی تاریخ بڑی تفصیل سے درج ہے۔ "دستنبو" نامی کتاب میں غالب ۱۸۵۷ء کے ایام غدر کی تباہی اور بربادی کا حال موثر نثر میں بیان فرمایا ہے اور اس تصنیف کی خصوصیت یہ ہے کہ عبارت میں عربی زبان کا کوئی بھی لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ "پنج آہنگ" نامی کتاب میں غالب نے اپنے خطوط، دیباچے، کتب کے خاتمے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر جمع کئے تھے۔ "اردوئے معلیٰ" غالب کا مشہور صحیفہ ہے جو سب سے پہلے دہلی کے اکمل المطابع نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں آپ کے خطوط جمع ہیں۔ "قاطع برہان" میں مشہور لغت "برہان قاطع" کے مولف کی غلطیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ ان معروف تصانیف اور تالیفات کے علاوہ غالب کی کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں، مثنویاں اور رسالے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی تھیں۔ جب غالب کے کلام پر اور ان کی نثر نگاری پر کچھ اخبارات میں اعتراضات شائع ہوئے تو ان کے جوابات بھی مرزا غالب کی طرف سے اکثر درج کئے جاتے تھے۔ مرزا غالب کے اردو خطوط کا ایک مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے آپ کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔

مرزا غالب کی تنگدستی، بادہ نوشی اور قمار بازی تو مشہور رہے ہی مگر عام طور سے کہا جاتا ہے کہ غالب ایک اچھے انسان، خوش مزاج، یار باش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر اور قابلِ تعریف آدمی تھے اپنی ایک خود نوشت سوانح میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ عبد اللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔ ...... گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سرپیچ موتیوں کی مالا خلعت پاتا ہے ......"

غالب پیدا تو آگرہ (اکبر آباد) میں ہوئے۔ مگر ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلی آگئے تھے۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس بلکہ پچپن برس تک دلی میں رہے۔ چاندنی چوک کے قریب

اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے کسی نہ کسی منزل میں تعلق رہا ہے۔

مرزا کی شادی ٩ راگست ١٨١٠ء کو الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ امراؤ بیگم دہلی کے ایک شریف ایک با اقبال گھرانے کی لڑکی تھیں۔ ان کے باپ کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ "شہزادہ گل فام" کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ شادی کے وقت امراؤ بیگم کی عمر بمشکل گیارہ برس تھی۔ مرزا غالب عمر میں امراؤ بیگم سے صرف دو برس بڑے تھے۔ شادی کے وقت عام خیال تھا کہ امراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں بھی حاصل رہے گا۔ لیکن یہ امیدیں خاک میں مل کر رہیں۔ اسد اللہ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد امراؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا۔ تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی لیکن بچپن کے پچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امراؤ بیگم سے کوئی وفائی نہ کی۔ عین عالم جوانی میں غالب نے ایک دوسری عورت سے بے قرارانہ عشق کیا۔ امراؤ بیگم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ جذباتی طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ غالب کے سات بچے ہوئے مگر کسی کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے داغ جدائی دے گئے۔ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد تھے اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے بھی میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ اکثر غالب اپنی بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے۔

غالب کو چوسر کھیلنے کے الزام میں قید کی سزا دی گئی تھی ١٨٤٧ء میں غالب پر قمار خانہ قائم کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا تھا اور اس کے نتیجہ میں وہ تین مہینے کابلی دروازہ قدیم دہلی کے جیل خانہ میں مقید تھے۔

مرزا غالب پچاس سال کی عمر میں بھی بھلے لگتے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ تھا، ڈاڑھی صفاچٹ تھی نازک باریک مونچھوں پہ تاؤ دے رکھتے تھے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں تھیں۔ چہرے کا رنگ سرخ و سپید تھا جس میں ایک طرح کی چمپئی دمک تھی۔ سر پر ایک تپلے کی ہلکی سی ٹوپی رکھتے تھے جس پہ کشیدہ کا کام واضح تھا۔ بدن پر تنزیب کا انگرکھا اور سپید پاجامہ، پاؤں میں گھیتلی جوتی پہنتے تھے۔ حقہ نوشی محبوب شغل تھا۔ کسی بھی محفل میں بیٹھتے تو وجیہہ اور با وقار نظر آتے۔ سارے مجمع میں مرزا کی شخصیت خاص طور پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ دوشنبہ ٢ ذی قعدہ ١٢٨٥ھ مطابق ١٥ فروری ١٨٦٩ء کو غالب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

غالب مرحوم کی صد سالہ برسی پورے اہتمام کے ساتھ منائی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ مرزا کی تصانیف کو عام کیا جائے۔ وہ چیزیں عوام سے قریب تر لائی جائیں جن کی بنا پر غالب کو شعر و ادب میں یگانہ حیثیت حاصل ہے یہ اعتراف کرنا ہی ہے کہ غالب نے وہ سانچے تیار کئے جن میں اردو کے متعدد شعرا نے فکر و نظر اور تاثیر و دل آویزی کے

(بقیہ صفحہ ٣٧ پر)

پروفیسر سید ابو تراب خطائی ضامن
صدر شعبہ اردو فارسی ۔ مہارانی کالج میسور

غالب کے مقطعے

مقطع طائے حطی کے کسرے سے جمع ہے مقطع کی جو واحد ہے اور جس میں طا فتحے سے آتی ہے اردو میں ایسے الفاظ کی جمع بنانے کا یہی قاعدہ ہے جیسے مصرع مجمع وغیرہ ۔ ہاں اگر مقطع اور مصرع لکھا جائے تو ان کی جمع مصرعے اور مقطعے بنتی ہے ۔ اسی طرح واحد لفظ مقطع مصرع کے بعد حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف آئے تو تیسرے حرف کا فتحہ کسرے سے بدل جائے گا ۔ مثلاً مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ۔ یہاں بھی طا کسرے سے پڑھی جائے گی ۔ اسی طرح مجمع میں بہت آدمی تھے ۔ یہاں مجمع کی میم کا فتحہ کسرے سے بدل جائے گا ۔

مقطع قصیدے یا غزل کے آخری شعر کو کہتے ہیں ۔ اسے مقطع کیوں کہا جاتا ہے یہ بات قابل غور ہے ۔ ممکن ہے اس لئے کہا جاتا ہو کہ اس پر سلسلۂ نظم قطع یا ختم ہوتا ہے ۔ یا اس لئے کہا جاتا ہوگا کہ اس پر نظم کی تکمیل اور اس سے نظم کی آراستگی اور پیراستگی ہوتی ہے ۔ ایک اور وجہ تسمیہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عربی شاعری کے اثر سے فارسی شاعری کا ہیولی تیار ہوا اور اردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے ۔ عربی میں فقط قصیدہ تھا ۔ فارسی والوں نے تنوع پیدا کیا ۔ قصیدے سے تشبیب کاٹ لی اور غزل بنا دی اور شاید مقطع وہ مقام ہے جہاں قصیدے سے کر کاٹ کر غزل کی شکل دی گئی تھی ۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ مطلع کے مقابلے میں مقطع کہتے ہوں وجہ تسمیہ چاہے کچھ ہو مقطع غزل کے آخری شعر کو کہتے ہیں ۔ مقطع بلاشبہ اہم ہوتا ہے ۔ بیت الغزل کی اہمیت سے انکار نہیں تاہم مقطع ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہوتا ہے ۔ رباعی کے چوتھے مصرعے پر رباعی کی تان ٹوٹتی ہے اور غزل کی تان مقطعے پر ۔ اس شعر میں شاعر تخلص بھی لاتا ہے ۔ تخلص لانے کا رواج فارسی میں مستقل طور پر سعدی سے شروع ہوا اور اردو میں ابتدا ہی سے تخلص کا رواج عام رہا ہے ۔ تخلص کی وجہ سے مقطع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ تخلص نہ ہوتا تو مقطع بھی غزل کا ایک معمولی سا شعر ہوتا ۔

مقطع ہی وہ مقام ہے جہاں تخلص کر سامنے آتا ہے اور ایسے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے جس سے اس کی شخصیت کا پرتو، نجی حالات اور عصری رجحانات کا انعکاس ہوتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے مقطعے بہت کام آتے ہیں جس سے اس نظریہ واقف ہیں۔

غالب کے مقطعے کلام غالب کا گراں قدر سرمایہ ہیں جو کبھی ان کی زندگی کا تابناک اور کبھی کربناک پہلو پیش کرتے ہیں۔ ان میں غالب نے وہ رنگینیاں دکھائی ہیں کہ باید و شاید۔ پڑھنے والا سر دھنتا رہ جاتا ہے حرف سخن گسترانہ بات دینے مقطعے کو لیجئے۔ اس سے غالب کی سخن وری، ماحول، معاصرانہ چشمک، دربار داری اور نہ جانے کتنی باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ غالب کی شخصیت متنوع ہونے کے علاوہ انفرادیت کی حامل تھی جس کا انہیں شدت سے احساس بھی تھا اور جس کا اظہار انانیت، خود پسندی سے ہوتا اور کبھی کبھی یہ رجحان تعلی کی حدوں کو چھونے لگتا۔ اردو شاعری کے عام، پامال اور فرسودہ راستے سے ان کی جدت پسند طبیعت نے الگ راہ نکال لی جس کو انہوں نے تفرد جذبات کے ساتھ اپنے کلام میں نمایاں جگہ دی ہے۔ اور عام رجحانات سے الگ تھلگ رہے۔ اگرچہ لال قلعے کے انداز بیان کے اثرات ان کی شاعری میں نمودار ہونے لگے تھے مگر غالب کی شخصیت زبان و بیان پر حاوی ہو گئی تھی اور یہ رجحانات پنپ نہ سکے ورنہ آج غالب کو بھی ان دوسرے درجے کے شاعروں میں شمار کیا جاتا۔ ان کی ژرف نگاہی اور قوت استقرائے منصف سخن کی ہر پابندی کو اپنے سے ہیچ گردانا۔ روایتی پابندیاں انہیں ناچار قبول کرنی پڑیں تاہم وہ بوقلموں کیفیتیں جن کے اظہار کے لئے ان کا دل و دماغ بے تاب تھا آشکار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ غالب کا ذہن کائنات اور ماورائے کائنات کی حقیقتوں کا نہ صرف ادراک بلکہ تفہیم و استدلال کرنے کی قدرت رکھتا تھا کلاسیکی روایت پرستی اس دور کے شاعروں کے مزاج میں رچ بس چکی تھی اور اس رہ گزر سے ایک قدم ادھر ادھر ہونا ان کی نگاہ میں گناہ عظیم سے کم نہ تھا۔ بھلا غالب کی منفرد شخصیت پر کیا کچھ طومار نہ باندھے ہوں گے۔

چونکہ غالب کے یہاں رسوم و قیود کے برعکس شخصیت کی بے نقابی اور انفرادیت کا اظہار ہوا ہے اس لحاظ سے وہ پہلے رومانی شاعر ہیں۔ رومانیت تو بظاہر عشق و محبت، فطرت پرستی یا فن سے بغاوت اور جذبات کی حمایت سمجھا جاتا ہے۔ حقیقتاً رومانیت کی خصوصیت تخیل اور اس کی پرستش ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگلستان میں اس تحریک نے زور پکڑا جب کہ صنعتی انقلاب نے انسانیت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ شاعروں کو چاروں طرف جبر و استبداد کے دیو منہ کھولے ہوئے نظر آ رہے تھے، ورڈس ورتھ کیٹس اور شیلی کی روحیں آزاد پرندوں کے مانند فضاؤں میں پرواز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ورڈس ورتھ نے فطرت پرستی کو اپنا شعار بنایا لیکن بھٹکی روحوں کو تسکین نہ بخش سکا۔ کیٹس اور شیلی بھٹکی ہوئی آزاد روحیں تھیں لیکن ان کے نغموں میں رومانیت یہی ہوا ہے جو تخیل پر پابندی کے خلاف گلہ شکوہ کرتی ہے۔ یہ تخیل کو مذہب سمجھتی ہیں۔ مرئی چیزوں کی نسبت غیر مرئی اشیا ان کی نظروں میں زیادہ وقیع ہیں۔ حقائق پر جذبات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ رومانیت نے شاعری میں تخیل اور وجدان کے لئے راہ ہموار کی اور

"آں تو کیا بولتے ہیں ماں کتو۔" بجی نے بڑے فخریہ بولے۔ "تصوف کے مسئلے ہیں نا! مسئلے ماں!"

"چچا! میں نے کہا۔ آپ نے دکنی لغت نہیں دیکھی۔ مسئلے معنی پہیلی۔"

"بجی: ایک نے پوچھا" تصوف کے کیا معنی؟

" ولیاں (ولیوں) کے پاس ایک سفوف تھاماں۔ بجی نے نہایت وثوق سے کہا "اس پو(پر) منتر پڑھ کو دپھٹکم) آنگ (جسم) پو ملتے تھے۔ مرتا سو ادمی بھی اٹھ کو (کر) کھڑا ہوجاتا"

ہم بجی کے علم وعرفان اور معلومات کے قائل ہوگئے۔

"غالب ہیں نا" بجی نے بیان جاری رکھا "ولیاں کا یہ منتر جان تیج (جانتے ہیں) انئے۔ مسئلے بی پھوڑنے (مراد بوجھنا) انئے۔ ات تاج (انتاہی) ہیں۔ رمضان کے دِناں (دنوں) میں تراجیاں بی پڑھتے انئے نیک بیج ادمی تھے

"ترابیاں! چچا غالب نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

"یہ دکنی تراویح کی جمع ہے چچا میاں، میاں چچا کے ہونٹوں پر سے انگلی ہٹائی۔

"ہاں تو چچا مس دکنی بولیں" اب بجی نے آگے فرمایا "ہاں تو ماں سنو۔ غالب اَچھیچ (اچھے) ادمی تھے۔ لیکن شیطان کے چھوڑیا (چھوڑا ہے) ماں؟ پچھے (پیچھے) لک کو تج (لگ گئی) ہے۔ سیندی دارو کی عادت پڑگئی نیں تو (نہیں تو) ولیچ (ولی ہی) ہوتے انئے۔

"چچا غالب نے لمبی سانس کھینچ کر فرمایا! "غنیمت ہے بجی" بادہ "کو ذلیل وخوار نہ کیا۔

"بات اصل یہ ہے چچا کہ ان کے شوہر شراب لانا اور فرمانے کہ استاد محترم نے کہا ہے کہ جو یہ شربت جس کا نام بادہ" ہے پیئے گا اسے یک گونہ بیخودی حاصل ہوتی اور اس پر شعر نازل ہوں گے۔ بجی نے سچ سمجھ لیا مگر جب وہ گرہ لگانے کے بجائے دھماکہ چوکڑی میں مشغول ہوگئے تو بجی کے نمازی والد محترم نے بتایا کہ یہ شراب ہے" ہم نے راز کی بات بتادی"

"خوب بی بی خوب! غالب کی پانچوں انگلیاں دانتوں تلے دبی ہوئی تھیں، فرمایا۔ پیرومرشد۔ اب اجازت دیجئے۔ اگر ہم دنیا میں ہوتے تو خدا کی قسم شعر کہنا چھوڑ دیتے۔"

"آپ شعر کہتے اور نہ ہمیں امتحان میں سر کھپانا پڑتا" مس ستار یہ بولیں۔ پیارے چچا جب آپ آہی گئے ہیں تو لگے ہاتھوں بھتیجیوں کے چند سوالات کے جوابات عنایت کرلاجواب کرجائیے؟

"بی بی، پیرومرشد بھی آپ پر غیرمعمولی مہربان ہیں، چچا بولے" اور نہ جانے ہم کس گناہ کی پاداش میں اب کچھ بھگت رہے ہیں۔ ذرا یہ بتاؤ کہ تم میں سے جو یہاں حاضر وناظر ہیں ان میں کوئی بھائی جان کی بہن شاگرد وغیرہ تو نہیں

"آخر بات کیا ہے چچا؟ میں نے مسکرا کے پوچھا۔

"خود تو میاں بھائی جان شیطان کی طرح نازل ہوئے، چچا بولے، ہم سے بہت کچھ اگلوالیا۔ پھر چوٹ بھی اور تعظیم بھی: دیتھی کہ ان کے ایک عزیز طالب علم وفرزند ارجمند تشریف لائے، پہلے تو فرمایا کہ انہیں شعر کہنا سکھا

دیا جائے۔ ہم نے انکار کیا تو فرمایا کہ احمق آپ کو کچھ سمجھ کر آئے۔ یوں ہی آپ کی ہوا بندھی ہوئی ہے۔ پھر کہا ایک پرچہ حل کیجیے اور کئی الفاظ پیش کر فرمایا کہ ان کو جملوں میں نہیں، اشعار ہی میں استعمال کی جائے اور اشعار ہی میں معنی بتایئے۔ ہم نے بلا تعبیل حکم مانا۔ بچے ہماری کمزوری ہیں۔ ہم نے احتیاط برتی اور جنت کے داروغہ سے عرض کیا کہ کوئی ہمارا پتہ پوچھے تو وہیں سے چلتا کرو۔ ہم تک نہ لائے۔ لیکن طرفہ تماشہ دیکھو، زمین سے ہی بلائے گئے۔ ہونہ ہو یہ مولانا بھائی جان کی ہی کارستانی ہے۔ سنا ہے ان کے ساتھ ایک استاد اب بالتیوم یا ھادق" بھی ہیں۔ یہ درشتہ جو کچھ کریں تھوڑا ہے۔ اب تک کسی کالج نہ پہنچا یا۔ آگے ڈر ہے کہ نانڈ دا نا چ نچا کر تماشہ اہل کرم دیکھنے کی بات نہ کریں۔

"بچی خدا جھوٹ نہ بلوائے" میں نے عرض کیا "کہتی ہوں سچ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے بھائی جان کا ہاتھ ضرور ہے۔ لیکن آپ کی شاعری سے وہ حد درجہ متاثر اور کچھ کچھ آپ کے جوا کھیلنے کی لت اور شراب نوشی سے نالاں ہیں۔ وہ شیفتہ ہو کر بھی شیفتہ نہیں۔

"بھائی جان ہیں مس شر بہت بولیں۔

"پھر تو بی بی کچھ ہلکے پھلکے سوال کرو۔ اور ہم ان کے بھاری بھر کم جواب دے جہاں سے نو دو گیارہ ہو جائے ورنہ مفت میں بدنام ہوں گے۔ تمہاری چچی ہی بدنام کر دیں گی کہ شراب یاد آگئی تو سیر دنیا کی۔

"بچی، میں بسم اللہ کرتی ہوں، میں نے طالبات مہارانی کالج کی میر کارواں بن کر کہا اور سوال کیا۔ جہاں آپ نے بیدل، شوکت بخاری، جلیل، اسیر کا اثر قبول کیا ہے وہاں بھی کسی کا شعر چرانے کی ہمت بھی کی۔ کم سے کم فارسی شعر کا اردو میں منظوم ترجمہ تو نہیں کیا۔ سوال نمبر دو۔ آپ نے اپنے ابتدائی کلام میں دریا۔ رفتار۔ موج۔ پرواز۔ جوش شوق۔ تمنا۔ تماشہ۔ جلوہ۔ بزم۔ نقش۔ بیاباں۔ وحشت۔ صحرا۔ آئینہ۔ شمع۔ شعلہ برق۔ آتش پرستار۔ چراغ دود۔ تپش۔ گداز اور نہ جانے ایسے کتنے الفاظ کو بار بار استعمال کیا ہے۔ ایسا کیوں کیا۔ لفظ چچی کو کیوں چھوڑ دیا پہلے پہل چچی کو دیکھ کر ہی غزلیں کہی ہوں گی ؟

سوال نمبر تین۔ کیا یہ سچ ہے کہ جب آپ نے چچی کی محبت و وفا کا بھرپور بدلہ نہ دیا تو چچی نے سہیلیوں میں اس راز کو فاش کرنے اور شکایت کرنے کی دھمکی دی تو آپ نے فوراً یہ شعر کہہ دیا کہ ؎

ہم کو ہے ان سے وفا کی امید
وہ نہیں جانتے وفا کیا ہے

سوال نمبر چار۔ چچا، شریف لوگ اچھی یا بری بیوی کے ہوتے ہوئے مغل بچہ بن ڈومنی کے عشق نہیں سناتے۔ سناتے ہیں تو دیدہ دلیری دکھاتے ہوئے خطوں میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ نتیجے میں منٹو نے افسانہ بنایا۔ اور سہراب مودی نے فلم۔ آپ نے یہ حرکت کیوں کی ؟

سوال نمبر پانچ۔ کیا یہ سچ ہے چچا کہ یہ شعر

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک

اصل میں بیچاری ڈومنی نے آپ کے تغافل کے ہاتھوں خاک ہوکر کہا اور آپ کو بخش دیا تھا۔

سوال نمبر چھے۔ چچا جان ہر کسی کو مرزا شیفتہ یا والہ و شیدا کچھ جوے کا کاروبار کیوں کیا۔ اس ڈر لے یا یا د معصد سے ہیں کم ہے کم ، یعنی داروغہ کو رشوت کیوں نہیں دی ؟

سوال نمبر سات - اپنے نام کے بجائے لطائف غیبی ، میاں داؤد خان سیاح کے فرضی نام سے کیوں لکھی۔ جب یہ نام فرضی تھا تو سورۂ اخلاص کے اللّٰہ الصمد نہیں بلکہ ایرانی صمد اصلی ہیں یا نقلی۔

سوال نمبر آٹھ - گستاخی معاف چچا ، رسوائی مقصود نہیں۔ حقیقت مقصود ہے۔ کیا آپ جب ترنگ میں ہوتے تو گناہ غزل نظر آتا اور آپ جنت کا مذاق اڑانے نہیں تھے ؟

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن جیسے ہی مایوسی نے گھیرا۔ تصدہ گریان کر امید کی دنیا بسانے اور ترنگ کی بات آتی کی آنکھ بن جاتی اور فرماتے ہ

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سوال نمبر نو : - چچا جان گھبرایے نہیں " یہ آخری سوال ہے ہاں تو چچا آپ مہارانی کالج کیوں نہیں آتے کسی ادبی مجلس کی صدارت یا مہمان خصوصی کی حیثیت کیوں نہیں قبول فرماتے۔

" بی بی ! چچا بولے " صرف آخری سوال کا ہلکا پھلکا جواب عرض کروں اور ہاتھ جوڑ رخصت چاہوں ، دوسرے سوالوں کے جواب تحریر کر آپ کے غلام شیطان کے ہاتھ روانہ کر دیگے ، تاکہ غالبیات میں اضافہ ہو۔ ہاں تو بی بی عرض ہے کہ مجھے تہتر جمع سوسال کا ہوجانے دو ساری بدگمانیاں دور ہو جائے گی۔ تب ہم کسی بھی ادبی مجلس یا مجلس زنان کی صدارت کر سکیں گے۔ عافیت بھی اسی میں ہے۔

من تصنیف یکے از طالبات۔ مہارانی کالج میسور ، سن ندارد ، روز و ساعت ندارد

.بی بی ، ہم یعنی محترم بھائی جان جدید و حاضر ، یکے از خاندان مولانا بھائی جان قدیم یہ جدید مخطوطہ آپ کے رسالے کے حوالے کرتے ہیں، چھاپ کر اپنے آپ کو ممنون کی ہیگا۔

از سیدہ محبوب النساء سلیم

قادرنامہ

برصغیر ہند و پاک میں جب تک فارسی کا چلن رہا اکثر بچوں کی ابتدائی تعلیم آمدنامہ کی مدد سے شروع ہوتی تھی جو بڑی مفید کتاب تھی۔ ریاست میسور میں ایک کتاب بعنوان "نردبان" برسوں پڑھائی جاتی رہی۔ خصوصاً ایسی کتابیں جو منظوم ہوں، بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ رونا اور گنگنانا کسے نہیں آتا، کی بات سنی ہے بچے گنگنانے کے بدلے گانا ہی پسند کرتے ہیں۔ چاہے ان کی آواز سماعت پر بار ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کو اپنی شکل اکثر اور آواز شیریں ہی معلوم ہوتی ہے، مکر فریب اور دھوکے سے جو بچنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دودھیل گائے کی لاتیں ضرور سہہ لی جاتی ہیں۔ مصلحت کا لفظ بھی عام ہے مصلحتاً بڑوں کی نادانیاں بھی برداشت کر لی جاتی ہیں۔ بچے تو بچے ٹھہرے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہر ادا مستانہ اور سر سے پیر تک پیاری ہوتی ہے۔ ان کی شیریں بولی، ان کی حسین چال۔ وہ اونٹ بھی بن جائیں تو ہر کل سیدھی اور پیاری نظر آتی ہے

غالب کو بچے پیارے تھے، وہ کئی باتوں میں خوش قسمت تھے۔ لیکن بچوں کے معاملے میں خاصے بدنصیب۔ یکے بعد دیگرے کئی اولادیں ہوئیں کوئی کلی پھول نہ بن سکی۔ غدر کا زمانہ ہے۔ بچے ساتھ ہیں۔ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ بچے سیماب صفت ٹھہرے پھر تتلی بولیوں میں جو مانگیں تھوڑا۔ بس چلے تو غالب تارے لائیں اور ان کو تھما دیں۔ لیکن وہ بے بس ہیں۔ وہ انسان ہیں۔ انہیں بچے پیارے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی لکھا۔ فارسی کا چلن تھا۔ ولی کے زمانے۔ اردو بھی نظم و نثر کے قابل زبان سمجھی جانے لگی تھی۔ بقول میرن صاحب۔ مرزا نے [illegible] خاں کے لئے قادرنامہ لکھا، یہ مثنوی (بقول حضرت امتیاز علی عرشی) جو خالق باری مصنفہ ضیاء الدین خسرو کی طرز پر۔ جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ قادرنامہ کے نام سے مجلس پریس دہلی میں کنہیا لال کے اہتمام سے ۲۲ محرم [illegible] مطابق [illegible] کو چھپی تھی۔ رضا لائبریری رام پور میں یہ ایڈیشن محفوظ ہے اور یہی میرا ماخذ ہے۔ مرزا صاحب کے اپنے کلام میں قادرنامہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن اس کے کلام غالب ہونے میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیونکہ یہ ان کی زندگی میں

ان کے نام سے شائع ہو چکی تھی"

حضرت عرشی کی اس تحریر سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ قادر نامہ حضرت غالب کی تصنیف نہیں۔ انتخاب کلام میں ممکن ہے مرزا کے نزدیک اس کی اہمیت نہ ہو اور ڈپٹی نذیر احمد کی طرح آپ نے بھی یہ کتاب صرف اپنے بچوں کے لئے لکھی ہو۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب ایک علم دوست قدر داں کے ہاتھ لگ گئی تو چھپ گئی۔ لیکن قادر نامہ مرزا کی زندگی میں ہی مجلس پریس دہلی نے چھاپا۔

غالب کے ایک شاگرد عبدالسمیع رام پور بیدل نے بھی اس قسم کی ایک کوشش "حمد باری" کی صورت میں پیش کی تھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

آسماں ہے چرخ گردوں اور فلک　　تارا اختر ہے فرشتہ ہے ملک
ہے زمیں ارض اور پتھر ہے حجر　　ہے کلوخ نے یار ڈھیلا اور مدر
پونجی سرمایہ ہے اور اسباب رخت　　بوریا جانو حصیر اور نگ تخت

چند شعراء نے منظوم لغت بھی لکھی ہیں۔ جہاں غالب کی تتبع کی ہے وہاں تحریر میں بظاہر مشکل و معنی میں دیگر الفاظ کو بھی نظم کیا ہے۔ اس سلسلے میں بہ قول محترمی سلیم تمنائی صاحب سلطان ٹیپو کے عہد کے مشہور مورخ اور شاعر میر حسین علی کرمانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حضرت جامی سے منسوب ایک فارسی رسالہ بہ عنوان "تجنیس اللغات" ملتا ہے۔ اسی رسالے کا گویا اردو ترجمہ کرمانی نے کیا ہے۔ لیکن جامی کا نام نہیں لیا۔ نہ جانے کیوں۔

خسروؔ کی "خالق باری" اور غالب کا قادر نامہ کے ساتھ قادر نامہ فرزئی اور عباس نامہ وغیرہ بھی اسی نوع کی اچھی کتابیں ہیں۔ اس قسم کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔ جون ۱۹۶۱ء کے "میزار رسالہ کراچی میں تحسین سرمدی کی ایک نظم بعنوان "نصرت نامہ" دیکھی۔ اس کے دو چار شعر ملاحظہ ہوں۔

گل کے معنے پھول ہیں غنچہ کلی　　راہ رستہ۔ خوف ڈر۔ کوچہ گلی
برگ پتا۔ شاخ ٹہنی۔ پھل ثمر　　اور پھل لگتے ہیں جس کو وہ شجر
شمس سورج، چاند کو کہتا قمر　　نجم تارا اور چنگاری شرر
ندی اردو اور دریا فارسی　　دیکھنے کا آئینہ ہے آرسی

"نصرت نامہ" قادر نامہ کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ مزید مفید چیزیں بچوں کے لئے لکھی جائیں اور مختلف تجربے کئے جائیں۔ کیوں کہ ہمارے ادب میں ابھی تک بچوں کے اچھے ادب کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے ہر آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں بچوں کے ادب کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں پیام تعلیم، الحسنات اور ایک حد تک کھلونا اور کلیاں اور بڑی حد تک مکتبہ جامع ملیہ نے بچوں کے ادب کے سلسلے میں بڑا مفید کام کیا ہے۔ خصوصاً پیام تعلیم میں بچوں کے لئے کافی اچھے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں نام رسالہ کا خیال پیام تعلیم میں نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اچھے مضامین نظم و نثر پر دھیان دیا جاتا ہے اسی طرح صرف بڑے نام کے ساتھ

کتابیں: چھاپی جائیں۔ پیام تعلیم میں شائع ہونے والے مزاحیہ مضامین میں ابو تمیم، یوسف ناظم۔ سائنسی مضامین میں خالد عرفان اور ڈراموں میں سلیم تمنائی اور اظہر افسر کی چیزیں اچھی ہوتی ہیں۔ ان میں کئی ایک حضرات نے بچوں کے سلسلے میں کامیاب تجربے بھی کئے ہیں۔

محترمی قیوم بھائی لکچرر مہارانی کالج میسور کے ارشاد یا خواہش پر جو سلیم صاحب کے ذریعہ پہنچی۔ قادر نامہ پیش کر رہی ہوں۔ یہ آج کمیاب ہے اور بچوں کے لئے نایاب بھی۔ یہ قادر نامہ میں نے دیوانِ غالب اردو مرتبہ حضرت امتیاز علی عرشی سے لیا ہے۔ اس طرح یہ بزرگ موصوف ہمارے اولین شکریے کے مستحق ہیں۔ پھر مدیرانِ رسالہ۔ بھائی قیوم صادق اور سلیم تمنائی صاحب بھی۔ اور آپ پسند کریں تو میرے نام کو بھی مستحق سمجھ لیں۔ چچا غالب کے ننھے سارے قادر نامے کی جو نقل کی ہے۔ ہاں تو قادر نامہ ملاحظہ ہو۔

قادر نامہ

(قادر، اللہ) اور (یزداں) ہے خدا — ہے (نبی مُرسل، پیمبر) رہنما
پیشوائے دین کو کہتے ہیں (امام) — وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے (صحابی) دوست، خالص (ناب) ہے — جمع اس کی، یاد رکھ (اصحاب) ہے
بندگی کا، ہاں (عبادت) نام ہے — نیک بختی کا (سعادت) نام ہے
کھولنا (افطار) ہے اور روزہ (صوم) — (لیل) یعنی رات، دن اور روز (یوم)
ہے (صلوٰۃ) اے مہرباں، اسم نماز — جس کے پڑھنے سے ہو راضی، بے نیاز
جانماز اور پھر (مُصلّا) ہے وہی — اور (سجّادہ) بھی گویا ہے وہی
(اسم) وہ ہے، جس کو تم کہتے ہو نام — (کعبہ، مکّہ) وہ، جو ہے (بیت الحرام)
گرد پھرنے کو کہیں گے ہم (طواف) — بیٹھ رہنا گوشے میں ہے (اعتکاف)
پھر (فلک، چرخ) اور (گردوں) اور (سپہر) — آسماں کے نام ہیں اے رشکِ مہر
(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ) — ہے محبت (مہر) لازم ہے نباہ
(غرب) پچھم، اور پورب (شرق) ہے — (ابر) بدلی اور بجلی (برق) ہے
آگ کا (آتش) اور (آذر) نام ہے — اور انگارے کا (اخگر) نام ہے
(تیغ) کی ہندی اگر تلوار ہے — فارسی پگڑی کی بھی (دستار) ہے

بھولا (راسو) ہے اور (طاؤس) مور
(خُم) ہے مٹکا اور تھلیا ہے (سُبو)
(چاہ) کو کہتے ہیں ہندی میں کنواں
دودھ جو پینے کا ہے وہ (شِیر) ہے
(سینہ) چھاتی (دست) ہاتھ اور (پای) پانو
(ماہ) چاند (اختر) ہیں تارے رات (شب)
(استخواں) ہڈی ہے اور ہے (پوست) کھال
تِل کو (کُنجد) اور (سَرِخ) کو گال کہہ
کیکڑا (سرطان) ہے، کچھوا (سنگِ پشت)
ہے (شکم) پیٹ اور بغل (آغوش) ہے
ہندی میں (عقرب) کا بچھو نام ہے
ہے وہی (گژدم) جسے عقرب کہیں
ہے لڑائی (حرب) اور (جنگ) ایک چیز
ناک (بینی) (دَبّہ) نتھنا (گوش) کان
(چشم) ہے آنکھ اور (مژگاں) ہے پلک
مُنھ پہ گر جُھرّی پڑے (آژنگ) جان
مَسّا (آژخ) اور چھالا (آبلہ)
اونٹ (اُشتر) اور (اُشغُر) سیہ ہے
ہے (ذَقَن) تھوڑی، گلا ہے (حنجرہ)
ہے (زنخ) تھوڑی (ذَقَن) بھی ہے وہی
پھر (غَلیواز) اس کو کہیے جو ہے چیل
لومڑی (روباہ) اور (آہو) ہرن
(اسپ) جب ہندی میں گھوڑا نام پائے
(گربہ) بِلّی (موش) چوہا (دام) جال
(خَر) گدھا اور اُس کو کہتے ہیں (الاغ)
ہندی چڑیا، فارسی (کُنجشک) ہے

(کبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
(آب) پانی (بحر) دریا، نہر (جُو)
(دُود) کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
(طفل) لڑکا اور بوڑھا (پِیر) ہے
(شاخ) ٹہنی (برگ) پتّا (سایہ) چھانو
دانت (دنداں) ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)
(سگ) ہے کُتّا اور گیدڑ ہے (شغال)
گال پہ جو تِل ہو اس کو (خال) کہہ
(ساق) پنڈلی، فارسی مٹھی کی (مُشت)
کُہنی (آرنج) اور کندھا (دوش) ہے
فارسی میں بھوں کا (ابرو) نام ہے
(بنش) ہے وہ ٹنک جس کو سب کہیں
(کعب) ٹخنا اور (شتا لنگ) ایک چیز
کان کی لو (نرمہ) ہے اسے مہربان
آنکھ کی پتلی کو کہتے ہیں (مَردُمک)
فارسی جھینکے کی تو (آونگ) جان
اور ہے دائی جنائی (قابلہ)
گوشت ہے (لحم) اور چربی (پیہ) ہے
سانپ ہے (مار) اور جھینگر (زنجرہ)
(خاد) ہے چیل، اور (زغن) بھی ہے وہی
چیونٹی ہے (مور) اور ہاتھی ہے (پیل)
(شمس) سورج اور (شعاع) اس کی کرن
(تازیانہ) کیوں نہ کوڑا نام پائے
(رشتہ) تاگا (جامہ) کپڑا (قحط) کال
(دیگداں) چولھا، جسے کہیے (اُجاغ)
مینگنی جس کو کہیں، وہ (پشک) ہے

(تابہ) ہے بھائی، توے کی فارسی
نام مکڑی کا (کلاش) اور (عنکبوت)
(پشہ) مچھر اور مکھی ہے (مگس)
بھیڑیا (گرگ) اور بکری (گوسپند)
نام (گل) کا پھول (شبنم) اوس ہے
(سقف) چھت ہے (سنگ) پتھر اینٹ (خشت)
(خار) کانٹا (داغ) دھبا (نغمہ) راگ
(زر) ہے سونا، اور (زرگر) ہے سنار
(ریش) داڑھی، مونچھ (سبلت) اور (بروت)
زندگانی ہے (حیات) اور (مرگ) موت
(جملہ) سب، اور (نصف) آدھا، (ربع) پاؤ
ہے (جراحت) اور (زخم) اور گھاؤ (ریش)
(ہفت) سات، اور (ہشت) آٹھ اور (بیست) بیس
ہے (چہل) چالیس، اور (پنجہ) پچاس
(دوش) کل کی رات، اور (امروز) آج
چاہیے ہے ماں کو (مادر) جاننا
پھاوڑا (بیل) اور درانتی (داس) ہے
سبز ہو جب تک، اسے کہیے (گیاہ)
(چکہ) چڑیا (کیسہ) کا تھیلی ہے نام
(انگنده) جھنجھنا (نیرو) ہے زور
(انگبین) شہد اور (عسل) بھی اے عزیز
(اجل) اور (آروغ) کی ہندی ڈکار
روئی کو کہتے ہیں (پنبہ) سن رکھو
(خانہ) گھر ہے اور کوٹھا (بام) ہے
ہے بنولا (پنبہ دانہ) لا کلام
گر (دریچہ) فارسی کھڑکی کی ہے

اور (تیہو) ہے توے کی فارسی
کہتے ہیں مچھلی کو (ماہی) اور (حوت)
(آشیانہ) گھونسلا، پنجرہ (قفس)
(میش) کا ہے نام بھیڑ، اے خود پسند
جس کو نقارہ کہیں وہ (کوس) ہے
جو برا ہے اس کو ہم کہتے ہیں (زشت)
(سیم) چاندی (مس) ہے تانبا (بخت) بھاگ
(موز) کیلا اور ککڑی ہے (خیار)
(احمق) اور (نادان) کو کہتے ہیں اُوت
(شوے) خاوند اور ہے (انباغ) سوت
(صرصر) آندھی (سیل) نالا (باد) باؤ
بھینس کو کہتے ہیں، بھائی (گاومیش)
(سی) اگر کہے، تو ہندی اس کی تیس
(ناامیدی) یاس اور (امید) آس
(آرد) آٹا اور (غلہ) ہے اناج
اور بھائی کو (برادر) ماننا
فارسی (کاہ) ہے اور ہندی (گھاس) ہے
خشک ہو جاتی ہے، تب کہتے ہیں (کاہ)
فارسی ہیں (دمیچے) کا (سیلی) ہے نام
(بادفر) پھرکی کا ہے اور ہے (دزد) چور
نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز
(مے) شراب اور پینے والا (میگسار)
آم کو کہتے ہیں (انبہ) سن رکھو
قلعہ (دژ) کھائی کا (خندق) نام ہے
اور تربز (ہندوانہ) لا کلام
(سرزنش) بھی فارسی جھڑکی کی ہے

ہے کہانی کی (فسانہ) فارسی　　اور (شعلے کی (زبانہ) فارسی

(نعل در آتش) اسی کا نام ہے　　جو کہ بے چین اور بے آرام ہے

(پست) اور ستو کو کہتے ہیں (سویق)　　(ژرف) اور گہرے کو کہتے ہیں (عمیق)

(تار) تانا (پود) بانا۔ یاد رکھ　　(آزمودن) آزمانا۔ یاد رکھ

(بوسہ) چمی، چاہنا ہے (خواستن)　　کم ہے (اندک) اور گھٹانا (کاستن)

خوش رہو، ہنسنے کو (خندیدن) کہو　　گر ڈرو۔ ڈرنے کو (ترسیدن) کہو

ہے (ہراسیدن) بھی ڈرنا، کیوں ڈرو　　اور (جنگیدن) ہے لڑنا کیوں لڑو

ہے گزرنے کی (گزشتن) فارسی　　اور پھرنے کی ہے (گشتن) فارسی

وہ (سرودن) ہے جسے گانا کہیں　　ہے وہ (آوردن) جسے لانا کہیں

(زیستن) کو جانِ من، جینا کہو　　اور (نوشیدن) کو تم پینا کہو

دوڑنے کی فارسی ہے (تاختن)　　کھیلنے کی فارسی ہے (باختن)

(دوختن) سینا، (دریدن) پھاڑنا　　(کاشتن) بونا ہے (رفتن) جھاڑنا

(کاشتن) بونا ہے، اور (کشتن) بھی ہے　　کاتنے کی فارسی (رشتن) بھی ہے

ہے ٹپکنے کی (چکیدن) فارسی　　اور سننے کی (شنیدن) فارسی

کودنا (جستن) (بریدن) کاٹنا　　اور (لیسیدن) کی ہندی چاٹنا

دیکھنا (دیدن) (رمیدن) بھاگنا　　جان لو، (بیدار بودن) جاگنا

(آمدن) آنا، بنانا (ساختن)　　ڈالنے کی فارسی (انداختن)

(سوختن) جلنا، چمکنا (تافتن)　　ڈھونڈھنا (جُستن) ہے، پانا (یافتن)

باندھنا (بستن) (گشادن) کھولنا　　(داشتن) رکھنا ہے، (سختن) تولنا

تولنے کو اور (سنجیدن) کہو　　پھر خفا ہونے کو (رنجیدن) کہو

فارسی سونے کو (خفتن) جانیے　　منہ سے کچھ کہنے کو (گفتن) جانیے

کھینچنے کی ہے (کشیدن) فارسی　　اور اُگنے کی (دمیدن) فارسی

اونگھنا پوچھو (غنودن) جان لو　　مانجھنا چاہو (زُدودن) جان لو

ہے قلم کا فارسی میں (خامہ) نام　　ہے غزل کا فارسی میں (چامہ) نام

کس کو کہتے ہیں غزل؟ ارشاد ہو　　ہاں غزل پڑھیے، سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا　　جمعے کے دن وعدہ ہے دیدار کا
وہ چرا دے باغ میں میوہ ، جسے　　پھاند جانا ، یاد ہو ، دیوار کا
پُل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ　　ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا
شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ　　آج عالم اور ہے بازار کا
لال ڈگی پہ کرے گا جا کے کیا　　پُل پہ چل ، ہے آج دن اتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ تو دکھلاؤں تمہیں　　کاٹ اپنی کاٹھ کی تلوار کا

واہ بے لڑکے ! پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے ، استاد کا

لو سنو کل کا سبق ، آجاؤ تم　　پوزی (آفسار) اور دُمچی (پاردم)
چھلنی کو (غربال ، پرویزن) کہو　　چھید کو تم (رخنہ) اور (روزن) کہو
(چہ) کے معنی کیا (چگویم) کیا کہوں　　(من شوم خاموش) میں چپ ہو رہوں
(بار خواہم رفت) میں پھر جاؤں گا　　(نان خواہم خورد) روٹی کھاؤں گا
فارسی کیوں کی (چرا) ہے یاد رکھ　　اور گھٹالا (درا) ہے ، یاد رکھ
(دشت ، صحرا) اور جنگل ایک ہے　　پھر (سہ شنبہ) اور منگل ایک ہے
جس کو ناداں کہیے ، وہ (نجان) ہے　　فارسی بیگن کی (بادنجان) ہے
جس کو کہتے ہیں جمائی (فاژہ) ہے　　جو ہے انگڑائی وہی (خمیازہ) ہے
(پارہ) کہتے ہیں کپڑے کو ، ہم سے پوچھ　　پاڑ ہے (تالار) ایک عالم سے پوچھ
جس طرح گہنے کی (زیور) فارسی　　اُس طرح ہنسلی کی (دَیَرگر) فارسی
بھڑ کی ، بھائی ، فارسی (زنبور) ہے　　دھنیا (آنبر) ہے اور (انبور) ہے
فارسی (آئینہ) ہندی آرسی　　اور ہے کنگھے کی (شانہ) فارسی
ہینگ (انگوزہ) ہے اور (آرزیر) رانگ　　(ساز) باجا اور ہے آواز (بانگ)

(زوجہ) جورو (بیزنہ) بہنوی کو جان　　(خشم) غصہ اور بدخوئی کو جان
لوہے کو کہتے ہیں (آہن) اور (حدید)　　جو نئی ہو چیز اسے کہیے (جدید)
ہے (نوا) آواز ، سامان اور اُول　　(نرخ) قیمت اور (بہا) یہ سب ہیں مول
(سیر) لہسن (اترب) مولی (ترہ) ساگ　　کھا (بخور) (برخیز) اٹھ (بگریز) بھاگ

بدوئی کی بولی کا ہے (پاغند) نام — (دُوک) تکلے کو کہیں گے لا کلام
(گیتی) اور (گیہاں) ہے دنیا، یاد رکھ — اور ہے (ندّاف) دھُنیا یاد رکھ
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ — فارسی (گلخن) ہے اور ہندی ہے بھاڑ
(تکیہ) (بالش) اور بچھونا (بِستَرا) — اصل (بِستر) ہے سمجھ لو تم ذرا
بِستَرا بولیں سپاہی اور فقیر — ورنہ (بِستر) کہتے ہیں برنا و پیر
(پیر) بوڑھا اور (برنا) ہے جواں — جان کو البتہ کہتے ہیں (رواں)
اینٹ کے گارے کا نام (آژند) ہے — ہے (نصیحت) بھی وہی، جو (پند) ہے
(پند) کو (اندرز) بھی کہتے ہیں ہاں — (ارض) ہے پر (مرز) بھی کہتے ہیں یاں
کیا ہے (ارض) اور (مرز) تم سمجھے؟ (زمیں) — (عُنق) گردن اور پیشانی (جبیں)
(آس) چکی، (آسیا) مشہور ہے — اور (فوفل) چھالیا مشہور ہے
بانسری (نَے) اور (جلاجل) جھانجھ ہے — پھر (اُستُردن) اور (عقیمہ) بانجھ ہے
(کُحل) سرمہ، اور سلائی (میل) ہے — جس کو جھولی کہیے، وہ (زنبیل) ہے
پایا قادر نامہ نے آج اختتام — اک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام

غزل

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں — مانتا، لیکن ہمارا دل نہیں
علم ہی سے قدر ہے انسان کی — ہے وہی انسان، جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار — آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رک رک کر سبق؟ — ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

اے

مطبوعہ مجلس پریس، دہلی، ۲۲ محرم سنہ ۱۳۸۰ھ

پروفیسر قیوم صادق
چیف ایڈیٹر سالنامہ "الماس" (غالب نمبر)
مہارانی کالج میسور

غالب

تنقید کی چھاؤں میں

غالب کے نقادوں میں سب سے پہلا نام تو غالب ہی کا ہے جس نے بڑی بے دردی سے اپنے ضخیم دیوان کو چند مختصر اوراق میں منتخب اور محدود کر دیا۔

اگر تنقید و تخلیق کی ان دو دنیاؤں کو یکجا کیا جائے اور نقّاد غالب کے تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر غالب کے کلام، انتخاب کلام اور معیار شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہوگی۔ نقاد غالب وہ ہے جو قتیل سے دست و گریباں ہوتا ہے۔

خسرو کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جھوم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پہ نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، خود اپنے دیوان کے معتدبہ حصّے پر خطِ نسخ کھینچ دیتا ہے شاعر غالب وہ ہے جو مذاق شعر کا اس درجہ قدر داں ہے کہ شیفتہ کی داد اس کے لئے حاصل کلام ہے۔ اور فضل حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلّم۔

شیفتہ نے غالب کے لئے اعلیٰ توصیفی کلمات استعمال کئے ہیں۔ شیفتہ کی تعریف اس بنا پر حیرتناک

ہوتو ہوکہ وہ ناقدردانی کے دور میں غالب کی بڑی قدر کرتے ہیں ۔ لیکن اس لحاظ سے قطعاً حیرت انگیز نہیں، ہے کہ غالب میں بھی عہد قدیم کی اعلیٰ ترین شاعری کی بنیادی خصوصیات تلاش کرتے ہیں اور غالب کو اس معیار پر رکھ کر ظہوری، خاقانی ۔ حافظ اور نظیری کے پہلو بہ پہلو بٹھاتے ہیں ۔

اس طرح شیفتہ غالب کے نقاد نہیں کہے جاسکتے ، ہاں وہ غالب کے دور کے نقاد ضرور ہیں ، اور غالباً اس دور کے مذاقِ سخن کے پاسبان بھی ۔ غالبیات کی باقاعدہ ابتدا تو یادگار غالب ہی سے ہوتی ہے ۔ حالی نے اردو میں نئے تنقیدی شعور کی داغ بیل پڑھی ۔ انہوں نے غالب کے نغموں میں ایک نئی صورت اور نئے آہنگ کا پتہ لگایا ۔

حالی کے بعد آزاد کے تبصرے کا ذکر عجیب بے محل سا معلوم ہوتا ہے ، تاریخی اعتبار سے آزاد کا تبصرہ یادگارِ غالب سے پہلے آتا ہے ۔ اہمیت کے اعتبار سے اس کا ذکر بعد میں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ یوں تو مرزا کے کلام میں معنی آفرینی اور نازک خیالی" کی دو خصوصیات کی تلاش اہم نہیں ۔ پھر بھی آزاد کا یہ فیصلہ " غالب نے آتے ہی ایک چوب سے نقارے پر ماری کہ کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے ۔ مگر سب کے منہ سے بے اختیار واہ نکل گئی ۔ گویا غالب کے دور کے مذاقِ سخن کی غمازی کرتا ہے ، جب جدت طرازی کو قدامت نے شرف قبول نہ بخشا تھا اور مرزا کی بانکپن اور بیدل پسندی طعن وتشنیع کا مورد بنا ہوئی تھی ۔

بجنوری کا مقدمہ ۔ تنقیدِ غالب نہیں ، غالب کی مدحت ہے ، نئی نسل کا خراجِ عقیدت ہے ۔ بجنوری کے نزدیک کلامِ غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

" وہ کون نغمہ ہے جو ان تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں "

مہدی افادی نے " یادگار غالب کے بارے میں لکھا تھا ۔ ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھا ہے ، اور آشنائے فن ہوکر لکھی ہے " یہ بات کسی حد تک بجنوری کے " محاسن کلام غالب " کے بارے میں کہی جاسکتی ہے ۔ ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی وکالت کرنے کی کوشش کی ہے ، اور آشنائے فن ہوکر کی ہے ۔

بجنوری نے جس بلند سطح پر غالب کی عظمت کا ستون استوار کرنے کی کوشش کی تھی اس سے ایک حلقے کو ناامیدی اور بے اطمینانی کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا ۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے کلام میں اس " روحانی ہم آہنگی " کی تلاش کی ، جس کا عکس بجنوری نے جگہ جگہ پیش کیا تھا ۔ اور ان کی تحقیق نے صرف اس نتیجے تک پہنچایا کہ

" بحیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اردو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر نائز نظر آتا ہے ۔ اور غالب کے کلام میں روحانی ہم آہنگی کی کمی ہے "

غالب عملاً صوفی نہ تھے ، عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیا کے بہت سے مروجہ عقائد کو مانتے تھے وہاں نہ تو وہ ان کے راہ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفہ فکر پیش کرتے تھے ان کے نزدیک ہمیشہ تصوف کو " برائے شعر گفتن خوب است " کا درجہ حاصل رہا ۔ اس کے باوجود وہ کہتے ہیں :۔

"بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو، عزیز رکھتا ہوں، اور اپنا گنتا ہوں، دوسرا مانے نہ مانے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"میں موحد ہوں ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

لا اِلٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

وہ صوفی نہیں تھے، وہ زندگی سے دامن کش ہونے کے قائل نہیں۔ البتہ اس کے دکھ درد کو رندی اور قلندری کے انداز سے گزارنے کے ضرور موئد ہیں۔ اس بنا پر نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ: ۔

اگر غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ تفاول اور مسرت تھا۔

ڈاکٹر عبداللطیف کی روحانی ہم آہنگی کی تلاش اگر انہیں اس دور کے فکر اجتماعی کے تجزیے تک لے جاتی تو یقیناً وہ اس سفید اور سادہ رنگ تک پہنچ جاتے ہیں جس میں سارے آفتابی رنگ مضمر ہیں۔

غالب میں اسی فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز محمد اکرام نے غالب نامے میں اسطرح پیش کیا ہے۔

"ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے معیار ہی میں اسلامی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی متعین فلسفہ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشو ونما کا ایک سامان چھوڑ گئے۔ جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے ....

.... ایک پہلو پر زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔

اکرام نے غالب کے مطالعہ کے سلسلے میں تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ غالب کو نہ حالی کی طرح قدیم معیاروں میں گم کر دیتے ہیں، نہ بجنوری کی طرح ان کے گرد گومٹے اور الہامی کتابوں کا مقدس دائرہ بناتے ہیں اور نہ لطیف کی طرح انہیں معمولی دنیادار انسان اور معمول سے کچھ ہی اعلیٰ شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اکرام نے غالب کا ان کی اپنی سطح پہ مطالعہ کیا ہے، اکرام کی رسائی غالب کے فکری تجزیے تک نہیں ہوتی۔ آخر اس طرز نو اور طرفگی ادا۔ اس تنوع اور انسان دوستی کی بنیادیں کیا ہیں۔ اس سوال کا جواب اکرام کے پاس نہیں ہے۔

عہد جدید میں بھی غالب کا مطالعہ ہر مکتبۂ تنقید کے لکھنے والوں کے لئے دل کش موضوع رہا ہے۔ ان میں فیض احمد فیض ہیں جنہوں نے غالب کے کلام میں ایک "واضح اور نمایاں وحدت" کی تلاش کی۔ اور اس بنیادی کیفیت یا موڈ کو اداسی کا نام دیا۔ یہ اداسی قنوطیت نہیں بلکہ ان کے الفاظ میں "کچھ ماضی کی یاد اور اس کے کھو جانے کا غم ہے۔ کچھ حال کی بے کاسی اور ویرانی کا احساس اور کچھ مستقبل میں ماضی کے لوٹ آنے کی حسرت، امید اور ناامیدی سے مل جل کر تشکیل پاتی ہے۔ اس اداسی کو فیض نے ایک فرد کی ذاتی کیفیت کے بجائے۔ ایک نسل، ایک دور کی اجتماعی کیفیت قرار دیا ہے۔ اور یہ دور چونکہ ہمارے ماحول اور ہماری اجتماعی

واردات سے بہت مختلف نہیں ہے۔ لہٰذا غالب کا جادو بھی چلتا جادو ہے

ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار نے غالب کے جسم پر کم و بیش ایک انقلاب قبا آراستہ کر دی۔ اور غالب کے آرٹ کو محض آرٹ کی بجائے ایک ایسے وجدان سے تعبیر کیا جو انہیں زندگی کے اس خارزار کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جہاں ہر کانٹے کی نوک ہماری قومی زندگی کے خون سے رنگین تھی۔

احتشام حسین غالب کے کلام میں طرفگی مضامین اور جدت ادا کی مادی بنیادوں کی تلاش کرتے ہیں ان کا استفہامیہ یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جس ندرت کا احساس حالی کے دور سے لے کر آج تک برابر کیا جا رہا ہے اس کے سماجی عوامل کیا تھے۔ جہاں وہ غالب کے ذہنی پس منظر اور اس دور کی فلسفیانہ روایت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہاں اس جدید عنصر کو کم و بیش غالب کے کلکتہ تک کے سفر کا اثر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا۔ اور کلکتے کے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں وہ عوامی طبقاتی کشمکش بھی بہت غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی۔ جو کبھی وہاں تحریک کی صورت میں۔ کبھی فرائض تحریک کی صورت میں اور کبھی ڈاکوؤں، سنیاسیوں اور ٹھگوں کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

کلکتے کا سفر کیا حقیقتاً غالب کی زندگی اور فن میں اس قدر عہد آفریں رہا ہے؟ کیا واقعی ان کے کلام میں طرفگی اور خیالات میں بانکپن کلکتے کے سرمایہ دار تہذیب کے زیر اثر ہی آیا ہے؟ یہ سوالات اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے۔ جب تک غزلیات کی صحیح تاریخ تصنیف اور غالب کی فکر کے مختلف ادوار کا صحیح تعین نہ کیا جائے۔

آل احمد سرور نے صحت مند تشکیک، کو غالب کا سرمایہ قرار دیا۔ یقیناً غالب صوفی نہ تھے وہ فلسفی بھی نہ تھے، لیکن ان کے پاس ایک ایسے ہوشمند کا دل و دماغ ضرور تھا جو پرانے تصورات سے نہیں ملتا۔ اور روایات کے آئینہ خانے میں گم ہو جانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ صحت مند فکر تشکیک کے بل بوتے پر کبھی بے دلی اور کبھی رندی و قلندری اور کبھی فلسفیانہ سپردگی کی مدد سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھ لیتا ہے۔

لیکن آل احمد سرور بھی اس صحت مند تشکیک اور ذہنی رجحان کے اجزائے ترکیبی تک جانے کی کوشش نہیں کرتے۔

جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہی لوگ جو ابتدا میں غالب کو مہمل گو سمجھ کر مذاق اڑاتے تھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کے مذاق و شعور میں رفتہ رفتہ کلام غالب نے کیسی تبدیلی پیدا کی۔ کہ وہی سب ان کے پرستار بن گئے۔ غالب نے اپنے مرنے سے پہلے ہی زمانے کو بدل دیا تھا۔ ادبی دنیا میں ان کے خیالات بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ گویا وسیع النظری عطا کر کے غالب کے اہلِ نظر کو اپنا لیا تھا۔ سو برس پہلے کے لوگوں کو سوچئے۔ ان کے مذاق کو دیکھئے ان کی قدامت پرستی پر نظر ڈالئے تو زمانے کا غالب کے اتنا قریب آجانا معجزہ سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ غالب سے بڑا عہد آفریں اردو میں کوئی نہیں پیدا ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا غالب کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

غالبؔ کی شخصیت دراصل اس کے کلام میں ہی ابھری ہے۔ جب اس نے بہت سے جذباتی تقاضوں اور بہت سی ناکامیوں اور نامرادیوں کا کا ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ یہ تبسم، یہ برداشت اور یہ وسعتِ قلب اس کی عام زندگی میں بھی موجود تھی لیکن بھرپور اظہار غالب کے کلام ہی میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ غالب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی تضاد اور تصنع سے محفوظ ہے اور اس ضمن میں غالب کے کلام اور اس کی زندگی کے مابین کوئی خلیج حائل نہیں۔

کلیم الدین احمد کہتے ہیں۔

غالبؔ نے حسنِ الفاظ تو سوداؔ سے نہیں سیکھا لیکن خیالات کی بلندی اور تخیل کی پرواز میں سوداؔ کا اتباع کیا۔ غالبؔ کا دماغ بلند اور تخیل وسیع تھا۔ ان کا مطمعِ نظر تنگ و محدود نہ تھا۔ اس لئے وہ مروجہ مضامین میں غزل پر قناعت نہیں کرتے .... غالبؔ کو بھی شعر مفرد کی کم ظرفی کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ اکثر مربوط غزل یا قطعہ بندی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن غالب نے بھی غزل کے نقائص کو رفع نہیں کیا...... چند خیالات کو ایک شعر میں کامل طور سے بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن غالب ایک خیال کو اس پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خیالات کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان دوسرے خیالات کی جستجو میں محو ہو جاتا ہے۔ گویا نشترستانِ خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے......

کلیم الدین احمد صنفِ غزل کی تجرباتی اور تعمیری بے ربطی و انتشار کی وجہ سے اسے بالیدہ فن کاری میں شمار نہیں کرتے۔ لیکن کلیم نے اپنی شاعرانہ وفن کارانہ قدروں کی وضاحت نہیں کی۔

صنفِ غزل کے متعلق اخترؔ اورینوی لکھتے ہیں۔

" صداقت وحسن کی منفرد ادائیں بھی قیمتی اور لذت بخش ہوتی ہیں اور ایسی چند اداؤں کو غیر منظم طور پر ایک ساتھ پیش کر دینے میں کوئی فن کارانہ قباحت نہیں .... ایک غزل قیمتی موتیوں کا ہار ہے، وہ تاج محل نہ سہی...... اعلیٰ غزلوں میں نیم وحشیانہ ابتری نہیں ہوتی بلکہ رومانی ربودگی پائی جاتی ہے۔

غالبؔ سے افکار میں ارتقا کا تصور جس کا سلسلہ قدیم مسلمان مفکرین اور برگساں سے ملتا ہے اس کی طرف پہلے پہل عبدالرحمٰن بجنوری نے توجہ دلائی۔ بعض اشعار ایسے بھی غالب کے یہاں ملتے ہیں جن میں طب کے اصولوں سے مستفیض ہونے کی کوشش کی گئی ہے ۔

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گیا
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے

سب سے دلچسپ وہ اشعار ہیں جن میں قانون کی اصطلاحوں میں حدیثِ دل ثابت ہوئی ہے ۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہاں میں اندھیرا
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

غالب کا کلام ہندی مغل تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے ۔ ان کے یہاں ہمیں انسان کی عظمت کا احساس زندگی یا نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ، قوی اور معنی خیز احساسات کو اظہارِ بیان کی گرفت میں لانے کی کوشش، اور کائنات کی دلفریب اور دلکش اشیاء سے لطف اندوز ہونے کی حرص پوری طرح نظر آتی ہے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کے تتبع کرنے والوں کے سلسلے میں عزیز لکھنوی کے کلام پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا ۔

" آج کل مرزا غالب کی تقلید عام طور پر پسند کی جاتی ہے لیکن جو فرق تقلیدِ اعمیٰ اور اتباعِ اہلِ بصیرت کا علم و مذہب کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے ۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا غالب کے خصائص صرف فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرتِ استعمال اور بشدۃ توالی اضافات اور ثقلی اشکال و غرابت میں محدود ہیں ۔ اگر کسی معمولی سی بات کو بلا ضرورت فارسی الفاظ و تراکیب میں نظم کر دیا جائے تو غالب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس گمراہی نے بہت سے لوگوں کو اس درجہ سے بھی محروم کر دیا جو بصورت عدم تقلیدِ غالب وہ حاصل کر سکتے تھے ۔ مرزا غالب کی اصل خصوصیت ان کے محاسن معنوی ہیں نہ کہ مجرد لفظی ۔ فارسی الفاظ و تراکیب بالقصد نہیں ہیں ۔ بلکہ بوجہ وسعت و بلندِ فکری و عدم مساواتِ ترکیب

اردو۔ پس تقلید اس کی ہونی چاہیے نہ کہ محض الفاظ کی۔ لہٰذا غالب کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں فارسی ترکیبیں باعتدال مستعمل ہوئی ہیں"

(بحوالہ مقدمہ مجموعہ غزلیات عزیز لکھنوی۔ از رحم علی الہاشمی)

عزیز اور لکھنو کے دوسرے شعراء نے غالب کی اندھی تقلید شروع کی تو اس کے ردعمل نے میرزا یاس یگانہ چنگیزی کو پیدا کیا جس نے حریفانِ لکھنو کی ضد پر "غالب شکنی" پر کمر باندھی۔ یگانہ کی ذہانت اور ان کی شاعرانہ صلاحیت سے انکار نہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے اندر توازن کی بڑی کمی ہے۔ وہ یک سُرے بھی ہیں اور نفسیاتی طور پر مریض بھی، اس لئے منفی پہلوؤں کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔ آیاتِ وجدانی کے دیباچہ نگار مرزا مراد بیگ شیرازی کا بیان ہے کہ "یگانہ پہلے غالب کے بڑے معترف تھے لیکن اہل لکھنو کی ضد میں یہ ثابت کرنے پر تُل گئے کہ غالب کے سارے اشعار مالِ مسروقہ کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ اس پر بھی کچھ نہ ہوا تو گالیوں پر اتر آئے اور اپنی ذہنی الجھنوں میں اور اضافہ کر لیا۔ غالب کا کیا بگڑا۔ یگانہ خود اپنی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ اس کا افسوس بھی ہوا کہ ایک منفرد غزل گو پھلنے پھولنے سے پہلے ختم ہو گیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ

غالب سے صحیح معنوں میں اگر کسی نے فیضان حاصل کیا ہے تو وہ اقبالؔ ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اقبالؔ نے غالب کا تتبع کیا ہے۔ اقبال کی شخصیت غالب سے بالکل الگ ہے اور اتنی منفرد کہ ان کے بنیادی عناصر میں کوئی شباہت نہیں۔ سر عبدالقادر مرحوم نے بانگ درا کا دیباچہ لکھتے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "اگر میں مسئلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو یہ سمجھتا کہ غالب کی روح نے اقبالؔ کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہے" یہ تنقید صحیح نہیں۔ اقبال نے غالب سے اسی طرح فائدہ اٹھایا ہے جس طرح انہوں نے اپنی کے تمام بلند پایہ شاعروں سے۔ انہوں نے اردو فارسی کے ادب عالیہ کی تمام زندہ روایات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔

غالبؔ نے عام شعراء کے برخلاف خطوط اور دوسری تحریروں کی شکل میں کافی مواد بھی چھوڑا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس ذہنی کشمکش اور ٹکراؤ کی پیداوار غالب کی شخصیت اور شاعری تھی۔ اسی پیچیدگی اور تصادم کا شکار آج کا انسان بھی ہے۔ اس سلسلے میں حسن عسکری کا خیال بھی غور طلب ہے کہ "آج کا عام آدمی بھی ذہین اور حساس ہوتا ہے اس لئے عمومی حیثیت سے آج شاعری میں تفکر کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔ آج کل کے عام شاعروں میں بھی کم و بیش روح بیدار کا وجود پہلے سے زیادہ نظر آتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ اردو شاعری میں غالب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے"۔ اور خدا ہی کیا وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت اس کے فرشتوں، اس کے دیر و حرم، اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کی ہر شئے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان سے لڑتے تھے۔ ان پر استہزا کرتے تھے۔ ہار کر مایوس ہوتے تھے اور فتح یاب ہونے کے لئے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے لئے آمادہ بھی کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا کچھ اور بھی ہم پہ ستم ہوئے

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غم ہے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری ہے
ولیکن کیا کروں آتی ہے جو رسوائی گریباں کی

غالب کے ہاں جو تازہ و شگفتہ استعاروں، تشبیہوں اور خصوصیت سے ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے، اس میں بھی دراصل یہی انفرادی اپج دکھانے کی کوشش کارفرما ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ "ہمارے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بعض مماثلتوں کی بناء پر مرزا غالب کو انگریزی کے مشہور ظرافت نگار چارلس لیمب سے مشابہت دیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اصولاً اس قسم کی کوشش مکابرہ ہے۔ کیونکہ ان دونوں انشاء پردازوں کے طریق فکر اور تربیت اور ذوق کا اختلاف یقینی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن دیوان غالب کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ "دیوان غالب کو ہم نئی نسل کی انجیل قرار دے سکتے ہیں۔ ہر نوجوان نے اس دیوان سے اوراق زندگی کے مختلف موڑ پر کبھی افسردگی، کبھی اشتیاق اور کبھی حسرت کے ساتھ ضرور رجوع ہوں گے۔ غالب نے ہم میں سے اکثر کی زندگی کی رفاقت کی ہے۔ وہ کبھی بے تکلف رفیق کی طرح ہماری حسرتوں میں شریک ہوئے ہیں، کبھی روشن دماغ ہمدرد کی طرح شادابی اور شگفتگی لے کر ہماری صحبتوں میں آئے ہیں اور کبھی ہماری آہوں اور آنسوؤں میں غم خواری کرتے رہے ہیں۔"

زندگی کی حسرتوں میں غالب نے جیتا جاگتا ڈھونڈی ہے۔ جو حسرت پرستی شعار کی ہے۔ اور ناکامیوں اور محرومیوں کے باوصف آرزومندی کی جو شمعیں جلائی ہیں ان ہی کی وجہ سے وہ اپنے دور کی فکر سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ غالب نے زندگی سے محبت کی ہے۔ اس کے کانٹوں کو چنا ہے، اس کے کرب و اضطراب سے اپنے پہلو کو گرمایا ہے لیکن نشاط و آرزومندی کی بھی شاداب اور صحت مند آگ سے ان کا سینہ ہمیشہ آباد رہا ہے۔

غالب کے بارے میں ایک خط ملا ہے جس کو ڈاکٹر محمد داؤد وقی نے دریافت کیا ہے۔ وہ خط شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی نے محمد حسین آزاد کو بھیجا تھا۔ آزاد نے آب حیات ترتیب دیتے وقت غالب کے صحیح واقعات واحوال دریافت کئے تھے۔ جس کے جواب میں انہوں نے غالب کے بارے میں جو لکھا ہے۔ ... پورا خط

مکتوب شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی

جناب من!

جب مجھے آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شائع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کہ بندے سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ فی الفور ... کو تیار ہونگے اس لئے ایک عذاب جاں بن جائیں گے۔"

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مرگیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرگیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ "مجھ سا شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا۔" طامع ایسا تھا کہ ایک قصیدہ دس جگہ بھیجتا تھا۔ اس لئے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں سیوم، دہم، نہم۔

میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو۔ میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں ہیں۔ غالب کا خود قول تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ایک غالب دوسرا امیر خسرو۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لئے دیا۔ اس نے ایک دفعہ دیکھ کر واپس کردیا اور کہہ دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضائع نکنیم، نمی دانیم کہ درکدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است"

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو عیسائی ہوگیا تھا۔ جان مور نام رکھتا تھا وہ ذوق کے پاس جاتا تھا وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے۔ وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورہ کی ایک دو غلطی۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم ونثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یافتوں کو سوجھتا ہے۔ اور منشی اور دبیر جو زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے۔

نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا سوائے چند مصادر کی تحقیقات

دلبرانہ ۔ غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی اور اس کو ایک ایسی فضا دی جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری وسعت جگہ پا کر زمانے کے سامان اور سہولتیں فراہم کی ہیں ۔

کتابیات

۱ ۔ اردو ادب میں تنقید کی اہمیت ۔ قیوم صادق

۲ ۔ اردو زبان کا مذہبی ورثہ ۔ قیوم صادق

۳ ۔ فلسفہ کلام غالب ۔ شوکت سبزواری

۴ ۔ رقع غالب مرتبہ پرتھوی چندر

۵ ۔ آئینۂ غالب

۶ ۔ احوال نقد و غالب مرتبہ حیات خاں سیال

۷ ۔ ماہنامہ تحریک دہلی اگست ۱۹۶۸ء ماہنامہ نگار فروری ۱۹۶۳ء و دیگر رسائل

غالب

اے فخر ادب شاعر اعجاز بیاں ثانی اردو ادب میں تیرا ہے کہاں

افکار کی وہ بلندی اللہ اللہ اشعار پہ الہام کا ہوتا ہے گماں

گووندا نصر اللہ